یہ خاموشی کہاں تک؟
ایک سپاہی کی داستانِ عشق وجنوں
لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) شاہد عزیز

پہلی قسط

مشرف نے کارگل جنگ پر رپورٹ مرتب کرنے سے روک دیا تھا

کارگل آپریشن کی کوئی منصوبہ بندی نہیں کی گئی۔ جی ایچ کیو میں بھی جائزہ نہیں لیا گیا۔ منصوبے کا علم صرف چار جنرلز کو تھا۔ یہ کہنا کہ بھارت کا حملہ ہماری پہل سے رک گیا اصل حقائق سے پردہ پوشی ہے۔ اس محاذ میں مجاہدین کا بھی کوئی حصہ نہیں تھا۔ جنرل (ر) شاہد عزیز کی کتاب "یہ خاموشی کہاں تک" سے اقتباسات

"سر یہ کچھ عجیب سے انڈیا کے مواصلاتی انٹرسیپٹ (Wireless intercepts) آرہے ہیں"، میں نے ہاتھ میں پکڑے کاغذات ڈی جی آئی ایس آئی کی طرف بڑھائے۔ بہت پریشان سی، بوکھلائی ہوئی باتیں تھیں، جھگڑ رہے تھے، "انڈیا کے فوجی بہت گھبرائے ہوئے نظر آتے ہیں" میں نے کہا۔ "لگتا ہے ہماری فوج نے کارگل کے علاقے میں کوئی بڑی کارروائی کی ہے"۔ انہوں نے ہاتھ کا اشارہ کیا کہ کاغذات اپنے پاس ہی رکھوں اور کہا بیٹھیں۔ لیفٹیننٹ جنرل ضیاالدین، جنہوں نے جنرل رانا کے بعد ISI کو سنبھالا، نہایت

با اخلاق اور مہذب انسان تھے، ہر ایک کی عزت کرتے، جب دفتر میں جاتا کھڑے ہو کر ملتے، ہمیشہ مسکرا کر بات کرتے۔ ایک دن پہلے بھی کچھ مشتبہ سے انٹرسیپٹس آئے تھے، تو میں نے کہا اس علاقے پر فوکس رکھیں، سوچا دیکھوں، کیا یہ کوئی مشق ہو رہی ہے یا معاملہ کچھ اور ہے۔ مگر آج کے انٹرسیپٹس سے تو لگتا تھا 10 کور نے کوئی جارحانہ کارروائی کی ہے۔ میں بیٹھ گیا تو انہوں نے بتایا کہ ہماری فوج کارگل کے خاصے بڑے خالی علاقوں پر قبضہ کر چکی ہے۔ شاید 3 یا 4 مئی 99ء کا دن تھا۔

دوسرے دن ایم او میں ہمیں بریفنگ کیلئے بلا لیا گیا۔ CGS، لیفٹیننٹ جنرل عزیز خان، سمیت تمام GHQ کے لیفٹیننٹ جنرل بھی موجود تھے۔ بریفنگ میجر جنرل توقیر ضیا، DGMO نے دی، جس میں بتایا گیا کہ ہماری فوج کی ناردرن لائٹ انفنٹری (NLI) اور ریگولر فوج کی یونٹوں نے کارگل کے علاقے میں وہ پہاڑی چوٹیاں قبضے میں کر لی ہیں جو خالی پڑی تھیں۔ ان میں سے کچھ پر تو ہندوستان کی فوج گرمیوں میں رہتی تھی اور سردیوں میں چھوڑ جاتی تھی، باقی ویسے ہی خالی پڑی تھی۔ اب ان جگہوں سے ہماری فوج کافی آگے تک جا چکی ہے اور اس کارگل روڈ پر ہمارے چھوٹے ہتھیاروں کا فائر گرتا ہے۔ راستہ بند ہو چکا ہے۔ اب سیاچن سیکٹر کی سپلائی لائن کٹ چکی ہے اور سردیوں کیلئے ڈمپنگ (ذخیرہ اندوزی) مکمل نہیں ہو سکے گی۔ انہیں سیاچن چھوڑنا پڑے گا۔ بعد میں پتا چلا کہ یہ تجزیہ MO کا نہیں، جوائنٹ اسٹاف ہیڈ کوارٹر (JS HQ) کا تھا۔ اگلے دن کارگل کی خبر اخباروں میں آ گئی۔

جنرل مشرف صاحب نے اپنی کتاب میں جو کارگل کی تاریخ رقم کی ہے، اس میں چند باتوں کی درستگی کرنا چاہوں گا۔ یہ ہماری تاریخ ہے اور اس قوم کے نوجوانوں کے خون سے لکھی گئی ہے۔ میں سمجھتا ہوں اگر حقیقت نہ بیان کی گئی تو ان کا لہو رائیگاں جائے گا۔ ہم نے 1971ء کی جنگ کی بھی حقیقتیں چھپا کر رکھیں اور آج پھر اسی راہ پر چل رہے ہیں۔ جب سچ پر پردہ ڈال دیا جائے تو اس سے کیا سبق کوئی سیکھے؟ جب سب ٹھیک تھا، کوئی غلطی نہیں ہوئی تو یقیناً آئندہ بھی ویسے ہی کیا جائے گا۔ پھر تاریخ کے کڑوے لمحے پلٹ کر آئیں گے، ہمارا خون بہائیں گے اور ہمارے حکمران ایسے ہی جھوٹ بولیں گے، جسے آج ہم سیاسی مصلحت کہنے لگے ہیں، جھوٹ نہیں۔ اب نہ تو اس کی کوئی گنجائش رہ گئی ہے اور نہ ہی حوصلہ۔

جن دنوں میں چیف آف جنرل اسٹاف (CGS) کے عہدے پر فائز تھا، 2002ء میں، میں نے کارگل کی جنگ کے بارے میں ایک مطالعاتی ریسرچ شروع کروائی، تاکہ فوج کی کمزوریاں سامنے آ سکیں اور ہم اپنی لڑائی کی صلاحیت میں بہتری لا سکیں۔ صدر صاحب کی اس جنگ کے بارے میں حساس طبیعت اور اس وقت کے ماحول پر سچ کے سیاسی اثرات کو دیکھتے ہوئے، میں نے اس اسٹڈی کو بٹالین کی سطح تک محدود رکھا۔ ہدف صرف یہ تھا کہ نچلے درجے پر، یعنی بٹالین اور اس سے نیچے کی سطح پر، جو کارروائیاں ہوئی ہیں، ان سے آئندہ کیلئے اسباق حاصل کیے جا سکیں۔ تمام حصہ لینے والی یونٹوں سے ان کی روداد اور تبصرے منگوائے اور اسٹڈی شروع کروا دی۔ پھر مشرف صاحب کو خبر ہوئی تو انہوں نے مجھ سے بہت ناراضگی کا اظہار کیا اور پوچھا کہ آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟ میں نے انہیں اسٹڈی کا مقصد بتایا تو کافی خفگی سے اسٹڈی فوری طور پر بند کروا دی۔ ISI میں اس قسم کی نہ ہی کوئی اسٹڈی کروائی گئی اور نہ ہی ہو سکتی تھی، کیونکہ اس کیلئے تمام 10 کور کی یونٹوں سے تفصیلات چاہیے تھیں، جو کارگل کے بعد کے دنوں جیسے ماحول میں ISI کو نہیں مل سکتی تھیں۔

ISI میں آنے سے پہلے میں دو سال MO میں رہ کر آیا تھا۔ وہاں کی چیزیں مجھ سے چھپی نہیں تھیں۔ جب MO میں بریفنگ کیلئے پہنچا تو پتا چلا کہ سوائے جنرل مشرف، لیفٹیننٹ جنرل محمد عزیز خان CGS جو کمانڈر فورس کمانڈ ناردرن ایریا (FCNA) گلگت بھی رہ چکے تھے، لیفٹیننٹ جنرل محمود (کمانڈر 10 کور) اور میجر جنرل جاوید حسن (کمانڈر FCNA) کے، کسی اور سینئر افسر کو اس کارروائی کا کانوں کان علم نہ تھا۔ حتیٰ کہ ہیڈ کوارٹر 10 کور کے اسٹاف بھی شروع میں اس سے ناآشنا تھے، جبکہ MO ڈائریکٹریٹ کو بھی بہت بعد میں پتا چلا، جب پانی سر سے گزر چکا تھا۔ یہ کہنا کہ فیصلہ کرنے سے پہلے اس کارروائی کا باقاعدہ GHQ میں جائزہ لیا گیا، سچائی سے بہت دور ہے۔ یہ باتیں پھر مختلف جگہوں سے بھی میرے علم میں آتی رہیں۔ MO اتنا ناکارہ ادارہ نہیں کہ تجزیوں کے ایسے نتائج نکالے۔

جب لڑائی کے اثرات کھل کر سامنے آئے تو کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ آرمی ہیڈ کوارٹر میں، صرف CGS کو بتا دینا کافی تھا؟ یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ بتانے سے بات چھپی نہ رہتی۔ آخر اعتماد کا کوئی تو دائرہ اعلیٰ قیادت کی سطح پر ہوگا۔ اس کے بغیر تو فوج جنگ نہیں لڑ سکتی۔ یہ کہنا کہ صرف چھوٹا سا کور کی سطح پر آپریشن تھا، کوئی بڑی کارروائی تو تھی نہیں کہ کسی کو بتاتے، غلط بات ہے۔

جنرل شاہد عزیز 1948ء میں لاہور میں پیدا ہوئے۔ اپریل 1971ء میں فوج میں کمیشن لیا اور کشمیر کے محاذ پر جنگ لڑی۔ نیشنل ڈیفنس یونیورسٹی سے فوجی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ڈائریکٹر ملٹری آپریشنز متعین ہوئے اور پاکستان کے ایٹمی ٹیسٹ سے منسلک رہے، جس پر انہیں تمغۂ بسالت سے نوازا گیا۔ جنرل بننے پر انٹر سروسز انٹیلی جنس (ISI) میں تجزیاتی شعبے کی سربراہی کی اور کارگل کی لڑائی اور اس کے اثرات کو دیکھا۔ پھر ڈائریکٹر جنرل ملٹری آپریشنز تعینات ہوئے۔ اس کے بعد کشمیر کے محاذ پر ڈویژن کی کمان کی۔ 11/9 کے بعد لیفٹیننٹ جنرل کے عہدے پر ترقی پا کر چیف آف جنرل اسٹاف کا منصب سنبھالا اور اس خطے میں امریکہ کے کھیل کو قریب سے دیکھا۔ فوج کے آخری دو سال لاہور کے کور کمانڈر کے طور پر فرائض انجام دیئے۔ 2005ء میں ریٹائر ہوئے اور فوجی سروس میں کارکردگی کی بنیاد پر ہلالِ امتیاز ملا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد نیب کے سربراہ کی حیثیت سے تقریباً ڈیڑھ سال کام کیا، پھر اصولی بنیاد پر استعفیٰ دیدیا۔

یہ خاموشی کہاں تک؟

لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کا شمار افواج پاکستان کے مایہ ناز، بلند ہمت، باکردار اور اصول پسند افسران میں ہوتا ہے۔ انہیں جس قدر کامیابیاں حاصل ہوئیں، اس کی وجہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر مکمل یقین ہے۔ جہاں کہیں بھی وطن عزیز کے دفاع اور قومی مفادات کا معاملہ سامنے آیا، وہ حکمرانوں کے سامنے بڑی جرأت اور استقامت سے حاضر سروس جنرل ہوتے ہوئے بھی اختلافی رائے پیش کرتے رہے۔ ڈائریکٹر جنرل تجزیاتی ونگ کی حیثیت سے کارگل کے محاذ کے حوالے سے انہوں نے ہمیشہ حقیقت پسندانہ تجزیہ اعلیٰ فوجی حکام کو مہیا کیا۔ نائن الیون (11/9) کے بعد امریکہ کیلئے فوجی سہولتوں کی فراہمی کے معاملے پر بھی اعلیٰ سطحی فوجی اجلاس میں کھل کر کلمہ حق بلند کیا۔ ان کی ملازمت کا عرصہ فیض کے اس مصرعے کی عملی تفسیر رہا:

جو رکے تو کوہِ گراں تھے ہم، جو چلے تو جاں سے گزر گئے

لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کی کتاب "یہ خاموشی کہاں تک" سے منتخب اقتباسات قارئین کی معلومات اور دلچسپی کے لیے پیش کیے جا رہے ہیں۔ ☆

دنیا میں تہلکہ مچ گیا۔ کیا یہ کوئی چھوٹی بات تھی؟ "اطلاعات ضرورت کے تحت (need to know basis) دی گئیں" ایک ایسا جملہ ہے جس کے پیچھے کارروائیوں کو چھپانے والا اوٹ لیتا ہے۔ آج ہر کوئی جانتا ہے کہ کس کس کو خبر ہونی چاہیے تھی اور نہ تھی۔ یہی جملہ 11/9 کے بعد بھی بار بار استعمال ہوتا رہا، مختلف پوشیدہ کارروائیوں کے انکشاف پر اور آج بھی استعمال ہو رہا ہے۔

خفیہ رکھنے کا صرف ایک ہی مقصد ہو سکتا ہے کہ یہ منصوبہ فوجی نکتہ نظر سے اس قدر کمزور تھا اور اس کی تیاری اتنی محدود، پھر حالات کی مناسبت سے اس کا وقت اتنا نامناسب تھا کہ کوئی بھی اس کے حق میں نہ ہوتا۔ شاید اس وجہ سے کسی کو بتایا نہیں۔ پھر سوال اٹھتا ہے کہ آخر کیا ہی کیوں؟ کیا اس کے کوئی اور مقاصد بھی تھے یا صرف ایک غلطی ہی تھی؟ شاید یہ راز کبھی کھلے۔

فوج میں جب بھی کوئی منصوبہ بنایا جاتا ہے، ہر قسم کی مشکلات اور دشمن کے ہر ردعمل کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ یہاں تو لگتا تھا کہ کوئی ردعمل متوقع ہی نہ تھا۔ بس فرض (assume) کر لیا گیا تھا کہ دشمن سہم کر بیٹھا رہے گا، ان پوسٹوں کو واپس نہ لے سکے گا اور مصالحت کی میز (negotiating table) پر آ جائے گا...... وہ جو آپ کا آدھا ملک کھا گیا، ڈکار بھی نہ لی۔ یہ کہاں تک درست ہوگا کہ اپنی صفائی میں کہہ دیا جائے کہ دشمن نے اوور ری ایکٹ (over react) کیا، ضرورت سے زیادہ بڑا جواب دیا، مکھی کو ہتھوڑے سے مارا؟ یہی مطلب ہوا کہ ہمارا تجزیہ غلط نہیں تھا، اس کا ردعمل ہی غلط تھا، ہم تو ہمیشہ کی طرح ٹھیک تھے! تجزیہ تو ردعمل کا ہی کرنا تھا، تو کیا ٹھیک تھا؟ کن مفروضوں (assumptions) پر یہ منصوبہ بنا اور بعد میں جو صفائیاں پیش کی جا رہی ہیں، حیران کن ہیں۔

میں ISI میں ہندوستان کی تمام کارروائیوں پر نظر رکھنے پر معمور تھا۔ ان کی طرف سے کوئی ایسی حرکت نہیں تھی جس سے یہ تجزیہ لگایا جائے کہ وہ کسی جارحانہ کارروائی کا ارادہ رکھتے تھے۔ جواُن کی کچھ پوسٹوں سے یہ تاثر دیا جا رہا تھا کہ پاکستان کی فوج کا حملہ اُن پر آیا اور اُسے مار بھگایا گیا۔ نچلی سطح پر کچھ انڈیا کے افسران کی تمغے لینے کی بھونڈی ترکیب تھی، جو بعد میں کھل گئی۔ ISI میں اس کی تفصیلات موجود ہیں۔

ہمارے پاس اس قسم کی کارروائی کرنے کا کسی قسم کا کوئی جواز نہیں تھا۔ شملہ معاہدے کے بعد سے، سوائے سیاچن کے، جہاں لائن آف کنٹرول (LOC) کی نشاندہی مکمل طور پر نہیں کی گئی تھی، کسی جگہ پر انڈیا نے یہ لائن پار نہیں کی۔ ایک آدھ مورچے کی سطح پر جھگڑا ہو سکتا ہے، اس سے زیادہ نہیں۔ اگر کسی معنی خیز پیمانے پر لائن پار کی ہوتی تو ہم نے اس پر کم از کم کوئی احتجاج تو یقیناً کیا ہوتا، دفتر خارجہ میں اس کا کوئی ریکارڈ (record) ہوتا۔ ایسا کچھ نہ تھا۔ ان کی طرف سے نہ ہی کسی حملے کی تیاری تھی اور نہ ہی کسی طرح سے کوئی ارادہ نظر آتا تھا۔ یہ کہنا کہ ہمارے سینئر کمانڈروں کی دور اندیشی اور چوکس رہنے کی وجہ سے انڈیا کا حملہ ہماری پہل (preemption) سے رُک گیا، حقیقت نہیں، محض اصلی حقائق کی پردہ پوشی ہے۔

یہ کہنا کہ LOC کے ساتھ خالی جگہوں پر قبضہ کرنا کسی معاہدے کی خلاف ورزی نہیں تھی اور زمین پر موجود کمانڈر کے دائرہ کار میں آتا تھا، غلط تصویر پیش کرتا ہے۔ اگر یہ کسی معاہدے کی خلاف ورزی ہی نہیں تھی اور ہم جو کر رہے تھے ٹھیک تھا تو ہندوستان سمیت ساری دنیا ہم سے لڑنے پر کیوں اتر آئی اور ہم اتنے گھبرا کیوں گئے، جیسے کوئی بڑا گناہ کر دیا ہو؟ ہندوستان تو اُس معاہدے کی خلاف ورزی لگاتار کر رہا ہے، جس میں فیلڈ مارشل ایوب خان نے تین دریاؤں کا پانی انہیں بخش دیا، محض اپنے دوست امریکہ کو خوش کرنے کی خاطر اور اپنے آقا ورلڈ بینک کے چند سکوں کے عوض۔ آج وہ ہمارا پانی بند کر کے ہماری زمینوں کو بنجر کر رہا ہے، ہمیں سیلاب میں ڈبونے کی صلاحیت حاصل کر چکا ہے، ہمارے دفاعی نظام کو درہم برہم کر سکتا ہے، مگر ہم پھر بھی سوائے چُر چُر کرنے کے کچھ آگے نہیں بڑھتے۔ کیا ہم اتنے گئے گزرے ہیں کہ ہم نے کوئی خلاف ورزی بھی نہیں کی، پھر بھی شامت آ گئی؟ ہم LOC سے میلوں آگے گھس بیٹھے، پھر بھی کیا کوئی معاہدہ نہیں ٹوٹا؟ یہ علاقہ 1971ء کی لڑائی کے بعد شملہ معاہدے کے تحت انہوں نے اپنے پاس ہی رکھا۔ اسے واپس لینے کا مجاز کیا زمین پر موجود کمانڈر ہی تھا؟ کسی اور کو بتانے کی ضرورت نہیں تھی؟ کیا یہ بجا توقع تھی کہ ہندوستان چپ کر کے بیٹھا رہے گا؟

FCNA کا منصوبہ دفاعی نوعیت کا ہرگز نہیں تھا۔ یہ مکمل طور پر جارحانہ کارروائی تھی اور LOC کے پار کے علاقے پر بلا اشتعال قبضہ کرنے کا منصوبہ، تاکہ سیاچن کے مواصلاتی راستے (lines of communication) کو کاٹا جا سکے، جو بذاتِ خود ایک بہکا ہوا مفروضہ تھا۔ یہ کوئی معمولی نتیجہ نہیں تھا، جو ہم حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اس کو چھوٹی سی (tactical) حرکت کہنا کیسے بجا ہو، جبکہ جنرل مشرف ہی کی کتاب میں یہ درج ہے کہ اس دشوار پہاڑی علاقے میں 800 مربع کلومیٹر علاقے پر ہم نے قبضہ کیا۔ کتابی طور پر تو ہماری اور ہندوستان کی ہر لڑائی tactical ہی کہلائے گی، مگر جب خود کہہ رہے ہیں کہ "معنی خیز اسٹریٹیجک اثرات" (significant strategic effects) حاصل ہوئے تو پھر یہ دفاعی نوعیت کا چھوٹا سا آپریشن کیونکر ہو سکتا ہے کہ صرف زمین پر موجود کمانڈر کے ہی دائرہ کار میں آتا ہو؟ اور یہ کہ 10 کور کے علاوہ کسی اور کو بتانے کی ضرورت نہیں تھی؟ کیا یہ سوچا نہیں تھا کہ اس آپریشن کے اثرات اسٹریٹیجک ہوں گے، بعد میں پتا چلا؟ کسی واقعے کے وقوع پذیر ہونے کے بعد تو اثرات سب کو نظر آ جاتے ہیں۔ فوجی لیڈر کی دانائی اگر اس قدر محدود ہے کہ فیصلہ لینے سے پہلے اسے اپنے فیصلے کے اثرات کا علم ہی نہیں تو اسے فوج کی کمانڈ کا ہرگز حق نہیں۔ مگر افسوس ہے کہ ہماری تاریخ میں ایسے کمانڈر فوج کو نصیب ہوئے۔

اس پوری لڑائی میں مجاہدین کا کوئی حصہ نہیں تھا۔ جب پہلی مرتبہ MO میں بریفنگ (briefing) کے لیے گیا تو جنرل توقیر ضیا (DGMO) نے بتایا کہ یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ فوج اس کارروائی میں شامل نہیں، ٹیپ پر ریکارڈ کیے ہوئے پشتو میں پیغامات وائرلیس پر شروع دن سے چلائے جا رہے تھے، تاکہ یہ تصور قائم ہو کہ یہ سب کام مجاہدین ہی نے کیے ہیں۔ یہ سن کر میں بڑا حیران ہوا اور میں نے سوال کیا کہ کیا فائدہ، کیونکہ ہماری اتنی فوج دشمن کے علاقے میں گھس بیٹھی ہے، وہ ہم سے لڑیں گے، کچھ ہمارا سامان بھی ان کے قبضے میں آئے گا، کچھ قیدی بھی اور کچھ شہیدوں کے جسم بھی۔ کسی بھی جنگ میں اس طرح کی بات چھپائی نہیں جا سکتی۔ اس پر جنرل عزیز بھی ناراض ہوئے اور کچھ بحث ہوئی پھر DGMO نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور کہا آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں، مگر ہوا ایسے ہی ہے۔

میں نہیں سمجھتا کہ ISI کو کارگل میں فوج کی کارروائیوں کی خبر نہ تھی، کیونکہ ان کے نمائندے ہر جگہ موجود ہوتے ہیں۔ اتنے بڑے پیمانے پر فوج کی نقل و حرکت، توپوں کو نئے علاقے میں لے جانا، اُن کا امونیشن جگہ جگہ پہنچانا چھپ نہیں سکتا۔ صرف گاڑیوں ہی کی حرکت، بات سمجھنے کو کافی ہوگی۔ پھر FCNA میں ہزاروں لوگوں کو ان کارروائیوں کا علم تھا۔ آپ اوپر کے درجے پر جتنی بھی خاموشی رکھیں ISI کے کارندوں سے یہ سب چھپ نہیں سکتا۔ جس ماحول میں یہ سب ہوا، یقیناً نواز شریف صاحب، جو پرائم منسٹر تھے اور جنہیں DG ISI خبریں پہنچاتے تھے، اس کی تیاری سے بے خبر نہیں ہو سکتے۔ اس کے علاوہ میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ اُن کو باقاعدہ طریقے سے بتایا گیا یا نہیں اور اگر بتایا بھی گیا تو کیا اور کتنا بتایا اور کیا تاثر دیا۔ ان دنوں سننے میں جو باتیں آتی تھیں ان سے یہی پتا چلتا ہے کہ بتایا گیا تھا۔ ایک صاحب نے تو یہ بھی کہا کہ بریفنگ کے بعد چائے کے دوران نواز شریف صاحب نے ان سے کہا، "جنرل صاحب، پھر آپ ہمیں کشمیر کب دلوا رہے ہیں؟" واللہ عالم۔ مجھے تو یقین نہیں کہ امریکہ بھی اس کارروائی سے لاعلم تھا۔

(جاری ہے)

☆☆☆☆☆

اتوار 03 فروری 2013ء
روزنامہ امت کراچی/حیدرآباد

قسط نمبر 2

کشمیر میں ایک اور محاذ کھولنے کی تجویز پر مشرف برہم ہوگئے

میرا کہنا تھا کہ کارگل میں پھنسی اپنی سپاہ کو نکالنے کے لئے یہ ترکیب کارآمد رہے گی- پریشان مشرف بولے- ''تم چاہتے ہو- معاملہ مزید بگڑ جائے-'' بھارتی میڈیا معاملے کو بڑھا چڑھا کر پیش کر رہا تھا- ہماری حکومت ایشو کو دبانے کی کوشش کرتی رہی- لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کی کتاب سے اقتباسات

جنرل شاہد عزیز 1948ء میں لاہور میں پیدا ہوئے۔ اپریل 1971ء میں فوج میں کمیشن لیا اور کشمیر کے محاذ پر جنگ لڑی۔ نیشنل ڈیفنس یونیورسٹی سے فوجی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ڈائریکٹر ملٹری آپریشنز متعین ہوئے اور پاکستان کے ایٹمی ٹیسٹ سے منسلک رہے، جس پر انہیں تمغۂ بسالت سے نوازا گیا۔ جنرل بننے پر انٹر سروسز انٹیلی جنس (ISI) میں تجزیاتی شعبے کی سربراہی کی اور کارگل کی لڑائی اور اس کے اثرات کو دیکھا۔ پھر ڈائریکٹر جنرل ملٹری آپریشنز تعینات ہوئے۔ اس کے بعد کشمیر کے محاذ پر ڈویژن کی کمان کی۔ 11/9 کے بعد لیفٹیننٹ جنرل کے عہدے پر ترقی پا کر چیف آف جنرل اسٹاف کا منصب سنبھالا اور اس خطے میں امریکہ کے کھیل کو قریب سے دیکھا۔ فوج کے آخری دو سال لاہور کے کور کمانڈر کے طور پر فرائض انجام دیئے۔ 2005ء میں ریٹائر ہوئے اور فوجی سروس میں کارکردگی کی بنیاد پر ہلالِ امتیاز ملا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد نیب کے سربراہ کی حیثیت سے تقریباً ڈیڑھ سال کام کیا، پھر اصولی بنیاد پر استعفیٰ دیدیا۔

لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کا شمار افواج پاکستان کے مایہ ناز، بلند ہمت، باکردار اور اصول پسند افسران میں ہوتا ہے۔ انہیں جس قدر کامیابیاں حاصل ہوئیں، اس کی وجہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر مکمل یقین ہے۔ جہاں کہیں بھی وطن عزیز کے دفاع اور قومی مفادات کا معاملہ سامنے آیا، وہ حکمرانوں کے سامنے بڑی جرأت اور استقامت سے حاضر سروس جنرل ہوتے ہوئے بھی اختلافی رائے پیش کرتے رہے۔ ڈائریکٹر جنرل تجزیاتی ونگ کی حیثیت سے کارگل کے محاذ کے حوالے سے انہوں نے ہمیشہ حقیقت پسندانہ تجزیہ اعلیٰ فوجی حکام کو مہیا کیا۔ نائن الیون (11/9) کے بعد امریکہ کیلئے فوجی سہولتوں کی فراہمی کے معاملے پر بھی اعلیٰ سطحی فوجی اجلاس میں کھل کر کلمہ حق بلند کیا۔ ان کی ملازمت کا عرصہ فیض کے اس مصرعے کی عملی تفسیر رہا:

جو رکے تو کوہِ گراں تھے ہم، جو
چلے تو جاں سے گزر گئے

لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کی کتاب ''یہ خاموشی کہاں تک'' سے منتخب اقتباسات قارئین کی معلومات اور دلچسپی کے لیے پیش کیے جا رہے ہیں۔

''سر یہ تجزیہ ٹھیک نہیں ہے۔ دراس کارگل روڈ کے کٹنے سے سیاچن سیکٹر کی سپلائی بند نہیں ہوتی''۔ جنرل مشرف نے پلٹ کر مجھے غصے سے گھورا، میں پیچھے بیٹھا تھا۔ کہا، ''آپ JS HQ کے اسٹاف کے ساتھ بیٹھیں اور سمجھیں کہ یہ حساب کیسے لگایا گیا ہے اور اگلے ہفتے آ کر اپنا نتیجہ پھر سے ہمیں بتائیں''۔ نیشنل ملٹری آپریشنز سینٹر (NMOC) کی میٹنگ ہو رہی تھی، جو کارگل لڑائی کے دوران ہر ہفتے ہوتی تھی۔ تمام افواج کے سربراہ، ان کے آپریشنز اور انٹیلی جنس کے اسٹاف، JS HQ کا اسٹاف، ISI کے سربراہ، سیکریٹری دفاع اور دفتر خارجہ کے نمائندے، سب حاضر ہوتے۔ وزیراعظم صاحب، جو اس کا حصہ ہیں، نہیں آتے تھے۔

JS HQ کی طرف سے پریزنٹیشن (Presentation) دی جا رہی تھی، جس میں یہ ظاہر کیا گیا تھا کہ دراس کارگل سڑک کٹ جانے سے سپلائی لائن (supply line) پر صرف تھوڑی سی گاڑیاں رات کو گزر سکتی ہیں۔ قریب 20٪ ٹرکل (trickle) باقی رہ گیا ہے، جو نومبر کے مہینے میں، زوجیلا پاس پر برف باری کی وجہ سے، بند ہو جائے گا۔ پورا حساب لگا کر بتایا گیا کہ سیاچن کی سپلائیاں سردیوں کے اختتام تک سوکھ چکی ہوں گی اور دشمن مجبور ہو جائے گا کہ سیاچن سے اپنی سپاہ نکال لے۔ میرا تجزیہ اس سے مختلف تھا۔

میرا ادارہ چونکہ قومی سطح پر دشمن کی صلاحیتوں اور کارروائیوں کا سرکاری تجزیہ کار تھا، لہٰذا ہم نے بھی اس پہلو کا تجزیہ کیا ہوا تھا۔ ہر ہفتے، میں بھی اس میٹنگ میں موجود ہوتا اور پاکستان کو درپیش خطرات کا تجزیہ (threat picture) پیش کرتا، ساتھ ساتھ اپنی سفارشات بھی۔ اس پیشکش کو جنرل ضیاالدین، ڈی جی آئی ایس آئی نے کبھی پہلے نہیں دیکھا، وہیں سنتے۔ میں نے پہلی مرتبہ پوچھا کہ آپ کو دکھا دوں تو انہوں نے کہا ضرورت نہیں، تم وہیں پیش کر دینا۔ میرے تجزیے میں ملٹری خدشات کے علاوہ اس جنگ پر اثر انداز تمام پہلوؤں کا جائزہ بھی شامل ہوتا۔ اس پر تبصرے کے بعد جنگ کی زمینی صورت حال DGMO بتاتے، پھر اس پر تبادلہ خیال ہوتا۔ دفتر خارجہ کے لوگ نہایت شش و پنج کا شکار نظر آتے، حیران رہتے کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔

میں ہر ہفتے اپنا تجزیہ پیش کرنے کے بعد اپنی سفارشات ضرور دیتا۔ ہر بار ان کا ایک ہی رنگ ہوتا کہ اب یہاں تک بات پہنچ چکی ہے، اتنا نقصان ہم اٹھا چکے ہیں، اب بھی اس میں سے کم از کم یہ مقاصد حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ ہر ہفتے یہ مقاصد گھٹتے جاتے۔ میں یہی سوچتا کہ اب کر جو بیٹھے ہیں تو اس میں سے جو نچوڑ سکتے ہیں نچوڑ لیں۔ مگر ان باتوں پر کبھی تبصرہ نہ ہوتا۔ سن کر آگے بڑھ جاتے۔

MO میں ہماری بریفنگ کے دوسرے ہی دن کارگل کی خبر اخباروں میں شائع ہو گئی تھی۔ پھر حکومت شدید تنقید کا نشانہ بنی اور خاصے دباؤ میں آ گئی۔ میں ان دنوں دو مرتبہ مشاہد حسین صاحب سے بھی ملا، جو اطلاعات و نشریات کے وزیر تھے۔ جب ان سے پوچھا کہ آخر

ہندوستان کا میڈیا تو اس بات کو اس قدر بڑھا کر لکھ رہا ہے اور پوری قوم کو جنگ کے لیے تیار کر رہا ہے، ہم اس پر اتنے خاموش کیوں ہیں؟ میں نے ان سے کہا کہ اسلام آباد میں سفارتی حلقوں کا تجزیہ ہے کہ پاکستان کی حکومت اس لڑائی میں کھڑے ہونے کو تیار نہیں۔ اس پر مشاہد صاحب نے بتایا کہ نواز شریف صاحب کے احکامات ہیں کہ اس بات کو زیادہ نہ اچھالا جائے، اس وجہ سے میڈیا کو دبا ہوا (low key) رکھا ہے۔ یہیں سے نظر آ رہا تھا کہ ہم بھاگنے کو تیار تھے اور اگر عوام کو زیادہ جوش دلوا دیا جاتا تو پھر جنگ سے نکلنا مشکل ہو جاتا، خاصا سیاسی نقصان اٹھانا پڑتا۔ نہ جانے پھر ہم اس آگ میں کودے ہی کیوں؟

سرینگر، زوجیلا، دراس، کارگل، لیح کی سڑک زوجیلا پاس پر سے گزرتی، جو سرینگر اور دراس کے بیچ میں واقع تھا۔ نومبر سے اپریل تک برف باری کی وجہ سے یہ پاس بند ہو جاتا، باقی سڑک کھلی رہتی۔ سرینگر سے راستہ کٹ جانے کی وجہ سے ہر سال گرمیوں میں، سردیوں کے موسم کے لیے راشن وغیرہ ذخیرہ (dump) کر لیا جاتا۔ اب تخمینہ تھا کہ کارگل کے مقام پر سڑک کٹنے کی وجہ سے گرمیوں میں صرف 20٪ سامان جا سکتا ہے، جو سردیوں میں زوجیلا کی وجہ سے بالکل بند ہو جائے گا۔ مگر ان نئے حالات میں ہندوستان اس کارروائی میں کچھ ردوبدل بھی کر سکتا تھا۔ زوجیلا کے پار کارگل تک میلوں لمبی سڑک تھی، جس کے دونوں جانب، پہاڑوں کی موجودگی کے باوجود، راشن ذخیرہ کرنے کی خاصی گنجائش تھی۔ اتنی موزوں نہ صحیح، لیکن ایمرجنسی کا بندوبست ہو سکتا تھا، کچھ کام کر کے بہتر بھی کیا جا سکتا تھا۔ یہ تو نہیں کہ سیاچن کا راستہ ہم کاٹ دیں اور دشمن ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھا رہے۔ گرمیوں کے موسم میں 20٪ آگے جاتا رہتا اور 80٪ یہاں ذخیرہ کرتے رہتے، جو تمام سردیاں کارگل کے 20٪ ٹرکل سے گزرتا رہتا۔ ڈمپنگ، جو ہر سال سردیوں میں بند ہو جاتی، اس سال کچھ نہ کچھ اس طرح جاری رکھ سکتے تھے۔ اس کی گنجائش JS HQ نے نہیں رکھی تھی۔

دوسری غلطی یہ تھی کہ لیح کے ہوائی اڈے پر صرف انڈین ایئر فورس (IAF) کے کارگو (cargo) جہازوں سے سامان لانے کا حساب کیا گیا تھا۔ یہ جیٹ ایئر فیلڈ ہے اور بڑے جہاز یہاں اتر سکتے ہیں۔ صرف انڈیا کے کمرشل جہاز ہی کافی تھے، ورنہ اور جہاز کرائے پر بھی لیے جا سکتے تھے۔ ساری ہی ضروریات ان سے پوری ہو سکتی تھیں۔ ہندوستان کوئی چھوٹی سی طاقت تو نہیں کہ اپنے مفاد کا دفاع کرنے سے قاصر ہو۔ پھر لداخ سے آنے والی سڑک پر بھی سامان کا حساب نہیں کیا تھا۔ اگرچہ یہ خاصا لمبا راستہ تھا مگر ہندوستانی فوج اسے رسد کی ترسیل کے لیے استعمال تو کر سکتی تھی۔ میں نے اگلے ہفتے یہ انکشافات (findings) بمعہ حساب کتاب NMOC میں پیش کر دیئے اور کہا کہ یہ مفروضہ درست نہیں کہ سیاچن کی رسد (supplies) سوکھ جائیں گی اور انہیں وہاں سے نکلنا پڑے گا۔ جب میں یہ کہہ چکا تو جنرل مشرف نے کوئی نکتہ نہ اٹھایا اور موضوع ہی بدل دیا، کسی سے کوئی اور بات شروع کر دی۔ ایسے لگا کہ میں کوئی نااہم سی بات کہہ رہا ہوں، جو بہتر ہے نہ سنی جائے۔ پھر DGMO کی پیشکش شروع ہو گئی۔

جیسے دشمن نے دھوکے سے چھپی ہوئی کارروائی کر کے سیاچن پر قبضہ کیا تھا، ویسے ہی چھپی ہوئی کارروائی سے ہم سیاچن کو واپس لینا چاہ رہے تھے۔ بنا سوچے سمجھے اور بغیر حوصلہ رکھے، بغیر کسی عزم کے۔ پھر اس دن کے بعد سے یہ کہنا چھوڑ دیا کہ کارگل میں ہمارا مقصد سیاچن کا راستہ کاٹنا اور دشمن کو مجبور کرنا تھا کہ وہ سیاچن ہمیں واپس کر دے۔ اب موضوع جان بچانے پر آ چکا تھا۔

☆......☆......☆

''سر، کشمیر میں ایک اور محاذ کھول دیں''، میں نے روسٹرم کے پیچھے کھڑے ہوئے کہا۔ جنرل مشرف چونک پڑے، پہلے ہی اتنے پریشان تھے، کھسک کر کرسی کے اگلے سرے پر آ گئے، پھر مجھ پر برس پڑے۔ ''تم کیا کہہ رہے ہو؟ اتنی بگڑی ہوئی صورت حال میں تم چاہتے ہو کہ میں بات کو اور بگاڑ دوں؟ جنگ کو پھیلا دوں؟'' میں بھی روسٹرم کے پیچھے سے باہر نکل آیا، دونوں ہاتھ کمر پر رکھ لیے۔ ''آپ نے جو سوال پوچھا اس کا کوئی اور حل نہیں ہے۔ اس کے سوا مورچوں کو گرنے سے بچانے کا کوئی اور طریقہ نہیں۔ میں جنگ پھیلانے کا مشورہ نہیں دے رہا، باعزت طریقے سے سپاہ کو نکالنے کا واحد حل تجویز کر رہا ہوں۔ اگر آپ اس کو مناسب نہیں سمجھتے تو کوئی اور طریقہ اپنے مورچوں کو دشمن کے قبضے میں آنے سے اور ان میں پھنسے ہوئے جوانوں کو بچانے کا نہیں ہے''۔

NMOC کی میٹنگ ہو رہی تھی۔ سب ہی بیٹھے تھے۔ کارگل کے سنگلاخ پہاڑوں پر ہماری پوسٹیں لگاتار گر رہی تھیں۔ ان دنوں جنرل مشرف اور جنرل محمود واضح طور پر خاصے پریشان دکھائی دیتے تھے۔ ہر کوئی اس بات پر تبصرہ کرتا۔ اب کارگل سے کسی طرح بچی کھچی عزت بچا کر نکلنے کا طریقہ سوچا جا رہا تھا۔ مجھے پچھلی NMOC کی میٹنگ میں جنرل مشرف نے کہا تھا کہ اس بات کا تجزیہ کر کے بتاؤں کہ پوسٹوں کو گرنے سے کیسے روکا جا سکتا ہے۔ PAF شروع سے ہی اس تنازعے سے باہر رکھی گئی تھی کہ بات بڑھ نہ جائے، جبکہ اُن کی ایئر فورس لگاتار کارروائیاں کر رہی تھی، ہمارے جوانوں پر برس رہی تھی۔ عجب منطق تھی، پہلے خوامخواہ چڑھائی کر دی، جنگ مول لی، پھر اپنے ہاتھ باندھ لیے۔ اتنا بھی کرنے کا حوصلہ نہ رہا جتنا دشمن کر رہا۔ ڈر گئے۔ ہوائیاں اڑنے لگیں۔ کیا یہ سب سوچا نہیں تھا؟

تمام زمینی حقائق کا جائزہ لینے کے بعد میں نے NMOC کی میٹنگ میں اپنا تجزیہ پیش کیا۔ دشمن کی کارروائیاں اور دیگر بیرونی حالات بتائے، جو کچھ یوں تھے۔ ہندوستان کی فوج پوری طرح بارڈروں پر نہیں لائی گئی تھی۔ حملہ آور فارمیشنوں کے ہر سیکٹر کے تھوڑے تھوڑے حصے دکھاوے کے طور پر ہمارے بارڈروں پر پہنچائے گئے تھے۔ بہت سی فوجی ٹرینیں جو منگوائی گئی تھیں، سپاہ کو لے کر نہیں چلی تھیں۔ کچھ واپس لوٹا دی گئی تھیں۔ بارودی سرنگیں نہیں بچھائی گئی تھیں، جس پر کافی خرچہ آتا ہے۔ کشمیر کا ذخیرہ (reserve) ڈویژن مدھوپور ہیڈ ورکس کے علاقے میں تھا، جس کی سپاہ دفاعی نوعیت (posture) میں سیالکوٹ اور شکر گڑھ دونوں اطراف اپنا جھکاؤ رکھتی تھیں۔ توپ خانے کا ایک بڑا حصہ کارگل کی نذر ہو چکا تھا اور کشمیر سے پیادہ فوج کی بہت سی یونٹیں بھی۔ سوائے کارگل کے کسی اور جگہ کوئی حملے کی تیاری تک نظر نہیں آتی تھی، بلکہ وہ ہمارے کسی مزید حملے سے خائف تھے۔ جنرل مشرف بھی اپنی کتاب میں لکھ چکے ہیں کہ ہندوستان کی فوج میں کسی اور جگہ حملہ کرنے کی فوری صلاحیت نہ رہی تھی اور کشمیر میں ہمارے جوابی حملے (counter offensive) کے لیے حالات سازگار تھے۔

ہندوستان نے صرف ہمیں روکنے کے لیے ایک سیاسی اور ڈپلومیٹک ہنگامہ کھڑا کیا تھا۔ ہر جگہ وہ یہی کہہ رہے تھے کہ اب ہم پوری جنگ لڑیں گے اور پاکستان کو سبق سکھائیں گے۔ امریکہ بھی ہمیں بھارت کے بڑے حملے سے ڈرا رہا تھا۔ دنیا بھی اس ہی وجہ سے خائف تھی۔ دنیا میں ہماری تصویر سہمے ہوئے جانور کی سی تھی۔ افسوس کہ اصلیت بھی یہی تھی۔

ہماری کئی پوسٹیں دشمن کے قبضے میں آ چکی تھیں۔ کچھ اور بھی گر چکی تھیں جو اب تک GHQ کو رپورٹ نہیں کی گئی تھیں۔ جھوٹ بولنے کے عام رواج کے مطابق غلط رپورٹیں دی جا رہی تھیں۔ باقی پوسٹیں بھی لگاتار دباؤ میں تھیں، گر رہی تھیں۔ کوئی کارگل کے دفاعی علاقے میں ایسا ردعمل نہیں تھا جس سے ان پوسٹوں کا گرنا روکا جا سکے۔ کارگل کی سپاہ جو کر سکتی تھی، پہلے ہی کر رہی تھی۔ PAF کو جنگ میں شامل نہیں کرنا چاہتے تھے۔ سپاہ کا مورال بھی گر چکا تھا۔ اب مزید پوسٹوں کو گرنے سے بچانے کا صرف ایک ہی طریقہ تھا کہ اس جنگ کو کشمیر کے چند اور علاقوں میں پھیلایا جائے، تاکہ دشمن کارگل سے فوج کم کرنے پر مجبور ہو۔ میں نے مشورہ دیا کہ اگر مورچوں کو گرنے سے بچانا چاہتے ہیں تو کچھ سپاہ سے 12 ڈویژن کے علاقے میں، جہاں سے دشمن کی ذخیرہ (reserve) سپاہ نکال کر کارگل لائی گئی تھیں، ایک چھوٹا محاذ اور کھول دیں اور کہیں کہ انڈیا نے جوابی حملہ کر دیا ہے۔ ہندوستان کی فوج کارگل کے محاذ سے سپاہ اور توپیں نکالنے پر مجبور ہو جائے گی۔ ان کے پاس فوری طور پر اور کوئی چارہ نہیں اور ہمارے پاس اپنی سپاہ کو محفوظ کرنے کا اور کوئی راستہ نہیں۔

آخر 1965ء کی لڑائی میں بھی تو یہی کیا تھا۔ اس کا تو کسی نے یقین نہیں کیا، ہم البتہ اب تک قوم سے یہی جھوٹ بولے جا رہے ہیں کہ جنگ دشمن نے شروع کی، جبکہ اس کا حملہ کشمیر میں ہمارے آپریشن جبرالٹر کی جوابی کارروائی تھی۔ اب تک 6 ستمبر مناتے ہیں۔ ڈھول بجاتے ہیں۔ اس بار چونکہ انڈیا کا اتنا دباؤ تھا اور ہم اس حالت میں نظر نہیں آ رہے تھے کہ مزید جارحانہ کارروائی کریں، ہماری بات اتنی آسانی سے ٹالی نہیں جا سکتی تھی۔ لوگ یقین کرتے کہ انڈیا ہی نے حملہ کیا ہوگا، لگاتار حملہ کرنے کی دھمکیاں جو دے رہا تھا۔ جنگ میں دشمن سے جھوٹ جائز ہے اور دوست کون تھا؟ میں نے کہا کہ اس سے یہ ہوگا کہ کارگل سیکٹر سے ہم پر، کم از کم کچھ عرصے کے لیے بوجھ کم ہو جائے گا۔ اتنے میں کچھ آبرو بچا کے جنگ سے باہر نکالا جا سکتا ہے۔ جب کارگل سے نکلیں گے تو دوسرے چھوٹے محاذ سے بھی ساتھ ہی نکل آئیں گے۔

خیر، میری منطق صحیح تھی یا غلط، وہ الگ بحث ہے۔ مجھ سے پوچھا گیا کہ مورچے گرنے سے کیسے بچائیں، میں نے واحد حل بتا دیا، جس میں یقیناً پیچیدگیاں تھیں، خدشات بھی۔ جنگ ہے ہی خدشات سے بھری چیز۔ اب اس میں کود جو پڑے تھے، پھر خدشات تو ہوں گے۔ یہ راستہ لینا ہے یا نہیں لینا، آپ کا فیصلہ تھا۔ یہاں کہنے کا میرا مقصد یہ ہے کہ اتنی بات ہونے کے باوجود، اپنی کتاب میں یہ لکھنا کہ زمین پر ہماری حالت کمزور (precarious) نہیں تھی اور دشمن ہمیں وہاں سے ہرگز نکال نہیں سکتا تھا، غلط ہے۔ یہ NMOC کی آخری میٹنگ تھی۔ چند روز بعد جنگ بندی ہو گئی۔ کیا کوئی جنگ کے اختتام کی حکمت عملی (war termination strategy) تھی؟ یا یونہی شرمندگی میں چادر لپیٹنا ہی مقصود تھا؟ (جاری ہے)

☆☆☆☆☆

قسط نمبر 3

کارگل میں پاک فوج کے سپاہی بھوکے پیاسے لڑتے رہے

پاک فضائیہ کو آخر تک محاذ سے باہر رکھا گیا-کور کمانڈرز کانفرنس میں کارگل جنگ کو ناکام کہنے پر مشرف نہ صرف ناراض ہوئے بلکہ اسے کشمیر کاز کیلئے سودمند قرار دیا- جنرل محمود- جنرل عزیز اور مجھے حکومت کا تختہ الٹنے کے احکامات دیئے- انہیں نجات دہندہ سمجھنا بہت بڑی غلطی تھی- لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کی کتاب سے اقتباسات

لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کا شمار افواج پاکستان کے مایہ ناز، بلند ہمت، باکردار اور اصول پسند افسران میں ہوتا ہے۔ انہیں جس قدر کامیابیاں حاصل ہوئیں، اس کی وجہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر مکمل یقین ہے۔ جہاں کہیں بھی وطن عزیز کے دفاع اور قومی مفادات کا معاملہ سامنے آیا، وہ حکمرانوں کے سامنے بڑی جرأت اور استقامت سے حاضر سروس جنرل ہوتے ہوئے بھی اختلافی رائے پیش کرتے رہے۔ ڈائریکٹر جنرل تجزیاتی ونگ کی حیثیت سے کارگل کے محاذ کے حوالے سے انہوں نے ہمیشہ حقیقت پسندانہ تجزیہ اعلیٰ فوجی حکام کو مہیا کیا۔ نائن الیون (9/11) کے بعد امریکہ کیلئے فوجی سہولتوں کی فراہمی کے معاملے پر بھی اعلیٰ سطحی فوجی اجلاس میں کھل کر کلمہ حق بلند کیا۔ ان کی ملازمت کا عرصہ فیض کے اس مصرعے کی عملی تفسیر رہا:

جو رکے تو کوہ گراں تھے ہم، جو چلے تو جاں سے گزر گئے

لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کی اجازت سے، ان کی کتاب ''یہ خاموشی کہاں تک'' سے منتخب اقتباسات قارئین کی معلومات اور دلچسپی کے لیے پیش کیے جا رہے ہیں۔☆

کچھ عرصے بعد، جب فوجی حکومت آ چکی تھی، تو ایک کور کمانڈر کانفرنس میں کسی کور کمانڈر نے کارگل کا حوالہ دیتے ہوئے اسے قطعی ناکامی (debacle) کہا۔ جنرل مشرف پھٹ پڑے۔ غصے میں کہنے لگے: ''ڈیبیکل! کیسا ڈیبیکل؟ تمہیں پتا ہے کشمیر کاز (cause) کو کتنا فائدہ پہنچا ہے؟ کارگل کی وجہ سے دنیا کی توجہ اس پر مرکوز ہوئی ہے۔ اب دنیا کو پتا ہے کہ کشمیر کے لیے ہم کہاں تک جا سکتے ہیں۔ یہ ہماری فتح ہے''۔ اب آخر میں آ کر کارگل کی جنگ کے مقاصد اور اہداف ہی بدل دیئے گئے، تاکہ جیت کا اعلان کر سکیں۔ چلے تھے سیاچن لینے، دنیا کے آگے کشمیر کاز لیے کھڑے ہو گئے اور کہا کہ منزل آ گئی۔ ہم اس ہی طرح ہمیشہ جیتتے ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ صرف کشمیر کاز ہی نہیں ہماری کن کن چیزوں کو کارگل کے شوشے سے دھچکا لگا۔ پورا ملک ہل کر رہ گیا۔ ہزاروں فوجیوں کا بے سود خون بہایا گیا۔ کشمیر وہیں کا وہیں کھڑا ہے۔ پھر مشرف اسے بیچنے ہندوستان بھی چلے گئے۔ آج ہم اس کی بات کرنے سے بھی ڈرتے ہیں۔

آہستہ آہستہ کارگل کی تصویر مجھ پر کھلی۔ اس کو غلط بیانی سے ڈھانپنے کی کوشش تو برسوں بعد مشرف صاحب کی کتاب آنے پر ہی کھلی۔ جنگ میں شامل اور اس سے منسلک رہنے والے حلقوں کی زبان سے بہت سی حقیقتیں بھی دیر سے منظر عام پر آئیں۔ اوپر سے لے کر نچلی سطح تک کے افسران نے ایک ہی تصویر پیش کی، اور پوری فوج اس سے واقف ہے۔ کارگل میں سپاہ کو تیاری کا وقت بہت کم ملا۔ سنگلاخ پہاڑوں پر قبضہ جمانا تھا، راشن اور امونیشن دے کر چڑھا دیا گیا۔ دشمن کے خالی مورچے اتنے کام نہ آئے، کیونکہ ہماری فوج کافی آگے نکل چکی تھی۔ چٹانوں میں مورچے تو کھود نہیں سکتے تھے، کھلے آسمان کے نیچے پتھر کی ڈھیریوں سے دیواریں کھڑی کر کے مورچے کی شکل دے دی، جنہیں سنگر کہتے ہیں۔ سب کے حوصلے بلند تھے، کیونکہ دشمن کے خالی علاقے پر قبضہ کر رہے تھے، اور کافی دنوں تک دشمن کا کوئی دباؤ بھی نہ آیا۔ پھر تخمینہ یہ بتایا گیا تھا کہ چھوٹے موٹے حملے ہوں گے، شدید دباؤ متوقع نہیں۔

جب لڑائی شروع ہوئی تو ہندوستان کے ہوائی جہازوں سے لے کر توپ خانے کی ایک بڑی تعداد وہاں جمع ہو گئی۔ ہم نے PAF کو لڑائی سے باہر رکھا، کیونکہ ہندوستان کا ردعمل دیکھ کر ہم گھبرا گئے، اور بات بڑھانا نہیں چاہتے تھے۔ لگاتار حملے شروع ہو گئے۔ ایک کے پیچھے ایک لہر آتی۔ لوگ پتھروں کے پیچھے ہی چھپتے رہے، گولے قریب بھی گرتے تو سنگر ڈھلک جاتے۔ ہوا میں پھٹنے والے گولوں سے کسی کو کوئی آڑ نہیں تھی۔ پھر ان اونچے پہاڑوں کی چوٹیوں سے نہ ہی وادیوں کی گہرائی میں نظر آتا تھا اور نہ ہی ان پر فائر گرتا تھا۔ جب دشمن کے حملے شروع ہوئے تو شروع میں وہ بھی چوٹیوں پر قبضہ نہ کر سکے، وادیوں میں بھر گئے، اور ہماری سپاہ کے تمام راستے کٹ گئے۔ لوگ پوسٹوں پر کئی کئی دن بھوکے رہے، زخمیوں کے خون رستے رہے۔ مگر یہ باہمت جوان، پاک فوج کے سپاہی اور ان کے شیر دل کمانڈر ہمارے میجر اور کیپٹن، آخری حد تک لڑتے رہے۔ کتنی ہی جگہوں پر، جب انہیں واپس نکلنے کا حکم ملا تو انہوں نے انکار کر دیا۔ آخری گولی، آخری سانس تک لڑتے رہے۔ یہی ہیرے آج بھی اس اندھیری رات میں یوں ہی چمکتے ہیں۔ ''کیوں؟'' نہیں کہتے، صرف ''کب'' [Yes sir] کہتے ہیں اور اپنا سرخ نور زمین پر بکھیر دیتے ہیں۔

ہم نے بلا مقصد انہیں آگ میں جھونک دیا۔ پھر کہا اب واپس آ جاؤ، غلطی ہو گئی۔ یہ ہمارے منہ سے نکلے ہر حکم پر جان دیتے ہیں۔ کسی نے نہ سوچا کہ اس مخلص جوان کے خون کی کیا قیمت ہے؟ اس نایاب لہو کو مٹی میں ملا کر کیا حاصل کرنا چاہتا ہوں؟ کسی نے انہیں اپنا بیٹا نہ سمجھا! اپنے ہی ہاتھوں سے انہیں قتل کر دیا۔ پھر ہنس کر کہا: ''میں نے بڑا تیر چلایا''۔ لاشیں بھی واپس نہ لیں، ان کی گنتی بھی نہ بتائی۔ کبھی اس ماں سے جا کر پوچھو، جس کے بیٹے کا نام چوک پر لگا دیا گیا ہے۔ اس سے پوچھو جس کے بیٹے کی لاش بھی، اور بہت سی لاشوں کی طرح، ہم نے دشمن سے واپس لینے سے انکار کر دیا تھا۔

اور کتنے نوجوانوں کے سینوں پر تمغے سجا کر اور ان کے ترانے گا کر، ہم اپنا مقصد حاصل کرتے رہیں گے، بچوں کا خون بہاتے رہیں گے؟ کب تک اپنی کوتاہیوں کو یوں چھپاتے رہیں گے؟ اگر بامقصد جنگ ہو تو ہر سپاہی کے لیے اس پاک سرزمین کی مٹی کو اپنے لہو سے سینچنا فخر کی بات ہے۔ یہی سپاہی کی زندگی کا مقصد ہے۔ لیکن جس جنگ کے مقاصد اور حقیقتوں کو، شرمندگی چھپانے کی غرض سے جھوٹ سے ڈھانپ دینا پڑے، اس جنگ کے لیے خون یوں ہی پتھروں پر ڈول دینا کہاں کا انصاف ہے؟ یہ کیسی قربانی ہے؟ کس کے لیے ہمارے بچے قربان ہوئے؟ ہم اب اور کتنے ترانے سنیں گے؟ کیا کوئی کبھی پوچھے گا؟

نہ کوئی جادہ، نہ کوئی منزل
کسی مسافر کو
اب دماغ سفر نہیں ہے
یہ وقت زنجیر روز و شب کی
کہیں سے ٹوٹی ہوئی کڑی ہے
یہ ماتم وقت کی گھڑی ہے...... (فیض)

......☆......☆......☆

''آپ تینوں میں سے ہر ایک انفرادی طور پر اس بات کا مجاز ہوگا کہ حکومت کا تختہ الٹنے کے لیے احکامات جاری کرے۔ میں آپ تینوں کو اس بات کا ذمہ دار ٹھہراتا ہوں، جنرل محمود، جنرل عزیز اور شاہد آپ''۔ جنرل مشرف نے میٹنگ ختم کرتے ہوئے ہمیں اس سلسلے میں بااختیار کیا اور ذمہ دار ٹھہرایا۔ ''یہ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اگر کسی وجہ سے آپس میں آپ لوگوں کا رابطہ نہ ہو سکے یا کوئی اور دشواری پیش آ جائے، تو پھر بھی کارروائی میں رکاوٹ نہ پڑے''۔ یہ کہہ کر وہ کھڑے ہو گئے۔ شاید یہ بات اس لیے بھی کہی ہو کہ کوئی ایک شخص آخری وقت پر پیچھے ہٹنا چاہے تو بھی کارروائی نہ رکے۔ ہم سب نے انہیں الوداع کہا اور اپنے گھروں کو لوٹ آئے۔

سری لنکا جانے سے پہلے یہ آخری ملاقات تھی۔ فیصلہ یہ تھا کہ اگر ان کی غیر موجودگی میں نواز شریف صاحب انہیں فوج کے سربراہ کی کرسی سے ہٹانے کی کارروائی کریں تو فوری طور پر حکومت کا تختہ الٹ دیا جائے۔ کئی دنوں سے ان کے گھر پر اس سلسلے کی ملاقاتیں جاری تھیں۔ ان ملاقاتوں میں میرے علاوہ لیفٹیننٹ جنرل محمود، کمانڈر 10 کور، لیفٹیننٹ جنرل عزیز خان، CGS (بعد میں جنرل بنے) میجر جنرل احسان الحق، DGMI (بعد میں جنرل بنے)، بریگیڈیئر راشد قریشی، DG ISPR اور چیف کے پرنسپل اسٹاف افسر موجود ہوتے۔

کچھ ہی عرصہ پہلے 14 ستمبر 1999ء کو میں نے ڈائریکٹر جنرل ملٹری آپریشنز (DGMO) کا چارج سنبھالا تھا۔ جنرل عزیز CGS تھے۔ ملاقات ہوئی اور حالات حاضرہ پر تبادلہ خیال بھی، نواز شریف صاحب کے کردار پر بھی۔ پچھلے آرمی چیف جنرل جہانگیر کرامت کو یوں نکال دینے پر ہم دونوں نے غم و غصے کا اظہار کیا۔ جس دن انہوں نے نیول کالج، لاہور میں کسی سوال کے جواب میں کچھ ایسا کہہ دیا کہ وہ حکومت کی ناراضگی کا سبب بنا، اُس سے شاید ایک دن پہلے، 29 ستمبر 1998ء کو میں بھی اس ہی کالج میں خطاب کے لیے مدعو تھا۔ میں ان دنوں ISI میں تھا۔ ملک میں جو کچھ ہو رہا تھا، نیوی کے افسران سے بھرے کمرے میں، اس پر دل کھول کر اپنی رائے کا اظہار کیا تھا۔ شاید سوچا ہو کہ کہہ دینے سے دل کا بوجھ کم ہو جائے گا۔

میں جہاں بھی بولتا کھل کر ہی بولتا اور ان دنوں ذہن پر حالات کا اتنا دباؤ تھا، نہ بولنا ظلم ہوتا۔ سورۃ رحمٰن میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے تمہیں بولنا سکھایا، پھر ایسے کڑے وقت میں منہ بند کیسے رکھتا۔ میری تقریر کے بعد حاضرین بہت مشتعل تھے اور مجھ سے کافی سوال کیے کہ جب آپ ان سب باتوں سے آگاہ بھی ہیں تو آخر فوج کیوں سوئی ہوئی ہے؟ کیا آپ لوگ یوں ہی آرام سے بیٹھے رہیں گے اور ملک کو تباہ ہوتا دیکھتے رہیں گے؟ ملک کی سیاست اور جمہوریت کے تصور اور اقدار پر بھی بحث ہوئی۔ کسی نے پوچھا کہ کیا جمہوریت جمہور کی بقا کے لیے ہے، یا جمہور جمہوریت کی بقا کے لیے؟ جو نظام عوام کے خون پر پلتا ہو، کیا اس کا ساتھ دینا قوم سے وفاداری ہو سکتی ہے؟ میرے پاس ان سوالوں کا کوئی جواب نہ تھا، کہہ دیا کہ فوج جو کر سکتی ہے مجھے یقین ہے کر رہی ہوگی اور آئندہ جو مناسب سمجھے گی کرے گی۔ اپنی بے بسی کا اظہار بھی کیا۔ مجھے ذرا علم نہ تھا کہ اگلے دن آرمی چیف کو ان سے خطاب کرنے آنا ہے اور اب یہ سوال ان سے دہرائے جائیں گے۔ میرے ذہن میں کوئی فتور نہیں تھا، بس دل کی پکار الفاظ میں ڈھل گئی۔

اُن دنوں اخباروں میں بھی اس ہی قسم کے تبصرے آتے رہتے۔ شاید ان ہی سے یہ رنگ سب نے لیا تھا۔ کچھ زمینی حقائق بھی ایسے ہی تھے۔ فوج کے کچھ سینئر افسران کو پارسل کے ذریعے تحفے کے طور پر کچھ لوگوں نے چوڑیاں بھیجی تھیں۔ یہ خبریں بھی اخبار میں آتی رہیں۔ کیا ان سب کے پیچھے بھی کسی کا ہاتھ تھا؟ میں کہہ نہیں سکتا۔ آج اتنا کچھ دیکھ چکا ہوں کہ کسی بات کا اعتبار کرنے سے ڈرتا ہوں۔

پہلی ملاقات میں جنرل عزیز سے خوشگوار ماحول میں اسی قسم کے موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ کہنے لگے، حکومت فوج کو پولیٹیسائز (Politicise) کرنا چاہتی، یعنی اس کو بھی سیاسی رنگ میں رنگنا چاہتی ہے، تاکہ جو بھی فیصلے حکومت کرے فوج اس کا ساتھ دے۔ لوٹ مار پر چپ رہے۔ جو افسر سیاسی حکمران سے ذاتی وفاداری رکھتے ہوں، صرف وہی ترقی پا سکیں، قابلیت کی کوئی اہمیت نہ ہو۔ ایک چیف نکال کر پھینک چکے ہیں، اب دوسرے کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑے ہیں۔ اس طرح تو یہ فوج کو تباہ کر کے چھوڑیں گے۔ ایک ہی ادارہ ان کے ہاتھوں سے بچا ہے، اس کا بھی ستیاناس کرنا چاہتے ہیں۔ پھر اس ملک کو تباہی سے بچانے والا کون رہ جائے گا؟ میں نے بھی ان باتوں کو مانا کہ بالکل یہی ہوتا نظر آ رہا ہے۔ میں ISI میں رہتے ہوئے بھی کافی کچھ دیکھ چکا تھا اور سن چکا تھا۔ سب کے ہی تاثرات ایسے تھے۔ سفارتی حلقوں سے لے کر افواج کے ارکان، سول سوسائٹی، غریب عوام، جن سے بھی ملتا، انہیں حکومت کے خلاف نفرتوں سے بھرا ہوا ہی پاتا۔

ایک آدھ دن اپنے کام میں مشغول رہا، پھر CGS سے ایک ملاقات اور ہوئی جس میں DG ملٹری انٹیلی جنس (MI) میجر جنرل احسان الحق بھی موجود تھے۔ انہوں نے بتایا کہ لیفٹیننٹ جنرل ضیاء الدین، نواز شریف صاحب سے گٹھ جوڑ کر رہے ہیں کہ جنرل مشرف کو ہٹا کر خود چیف بن جائیں۔ نواز شریف کا ارادہ پختہ ہوتا نظر آ رہا ہے اور یہ فوج کی تباہی پر تلے ہوئے ہیں۔ کچھ دن ملاقاتوں میں DGMI اسی قسم کی خبریں لاتے رہے اور ہم ان پر تبصرے کرتے رہے۔

جو تفصیلات بعد میں علم میں آئیں، ان سے یہی لگتا ہے کہ جنرل ضیاء الدین، نواز شریف صاحب سے فوج کے سربراہ کے خلاف، ذاتی مفاد میں، گٹھ جوڑ کر رہے تھے۔ ان کا کردار یہ ہونا چاہئے تھا کہ وہ اس صورت حال کو ڈی فیوز (defuse) کرنے کی کوشش کرتے۔ وہی ایک شخص تھا جو ان دونوں کی کدورتیں ختم کر سکتا تھا۔ ادھر وہ وزیر اعظم کو بھڑکا رہے تھے اور ادھر DGMI چیف کو خبریں پہنچا رہے تھے۔ دونوں ہی ایک دوسرے سے خائف تھے۔

پھر ایک شام جنرل مشرف نے ہم سب کو اپنے گھر بلا لیا۔ کچھ دیر سیاسی حالات پر اور نواز شریف اور جنرل ضیاء الدین کے بارے میں اس ہی قسم کی باتیں کیں، جو جنرل عزیز اور جنرل احسان پہلے بھی کرتے رہتے تھے۔ جنرل احسان نے جنرل مشرف کو سبکدوش کرنے کے بارے میں نواز شریف اور جنرل ضیاء کی سرگرمیوں کے بارے میں کچھ خبریں دیں۔ پھر جنرل مشرف نے کہا کہ ہمیں ہر حالت میں فوج کو تحفظ دینا ہوگا۔ اگر اس بار پھر نواز شریف صاحب آرمی چیف کو ہٹانے کی کوشش کرتے ہیں تو ان کو وزیر اعظم کی کرسی سے ہٹانے کے سوا اور کوئی راستہ ہمارے پاس نہیں۔ ہمیں حکم دیا کہ اس سلسلے کی تیاری کر لیں۔ اس موضوع پر بھی بات ہوئی کہ تختہ الٹنے کے بعد، فوج کا حکومت کرنے کا کوئی ارادہ نہیں اور نہ ہی مارشل لا لگایا جائے گا۔ جنرل مشرف نے جمہوریت پر اپنا اعتماد ظاہر کیا اور کہا، لیکن ایسی جمہوریت جو عوام کی صحیح نمائندگی کرتی ہو، انہیں لوٹنے پر ہی نہ لگی رہے۔ سیاست کے نظام پر بھی بات ہوئی۔ انہوں نے کہا کہ نظام میں کچھ ایسی تبدیلیاں کریں گے کہ اچھے لوگ حکومت کی کرسیوں پر فائز ہو سکیں اور چور بازاری کا ماحول ختم ہو۔ پھر شفاف الیکشن کرا کے، حکومت عوام کے بہترین نمائندوں کو سونپ دیں گے۔ فوج کا کام حکومت چلانا نہیں۔

پھر ایک شام اور اسی طرح ملاقات ہوئی اور تازہ ترین صورت حال جنرل احسان نے پیش کی۔ ہم نے اپنی تیاریوں کے بارے میں بتایا۔ کچھ کا خیال ہے کہ فوج میں تختہ الٹنے کا منصوبہ تیار ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ فوج میں کسی بھی غلط کام کا یوں کھل کے حکم نہیں دیا جا سکتا۔ فوج کی نہ ایسی تہذیب ہے اور نہ ہی رواج۔ البتہ کچھ لوگ مل کر سازش کر سکتے ہیں، جیسا اب ہو رہا تھا۔ ویسے بھی تختہ الٹنا کوئی ایسا پیچیدہ کام تو ہے نہیں جس کے لیے کوئی لمبی منصوبہ بندی کی ضرورت ہو۔

میں نے بھی اپنی تیاری کے بارے میں بتایا کہ چیف کے حکم کے مطابق، ایک متبادل منصوبہ اسپیشل سروسز گروپ (SSG) پر مبنی بھی بنا لیا ہے، جس میں ہیلی کاپٹروں کے ذریعے کارروائی ہوگی۔ اس پر چیف نے اجازت دی کہ ان کے چنے ہوئے اشخاص کو اعتماد میں لے سکتا ہوں تاکہ تیاری مکمل کی جا سکے۔ میں نے اس خدشے کا اظہار کیا کہ آپ بنا حفاظتی دستے کے پرائم منسٹر ہاؤس میں جاتے ہیں، ایسا نہ ہو کہ وہ آپ کو وہیں بٹھا لیں اور نیا چیف لگا دیں۔ پھر نئے چیف کے فعال ہونے تک آپ کو وہیں رکھیں، لیکن جنرل مشرف نے اس صورت حال کو ممکن نہ سمجھا۔

شاید ایک یا دو ملاقاتیں اور ہوئیں، صحیح یاد نہیں۔ کسی ایک ملاقات میں جنرل احسان نے بتایا کہ نواز شریف صاحب، جنرل مشرف صاحب کو ہٹانے کا فیصلہ کر چکے ہیں اور اس سلسلے کی ایک خفیہ ملاقات دبئی میں بھی ہوئی ہے، جس میں جنرل ضیاء بھی شامل تھے۔ لیفٹیننٹ جنرل طارق پرویز (کوئٹہ کے کور کمانڈر) کی بے وفائی اور نقل و حرکت کا قصہ بھی جنرل احسان نے بیان کیا کہ یہ کس طرح نواز شریف صاحب کے ساتھ اس کھیل میں شامل تھے۔ ان ہی حرکات کی وجہ سے ان کو ریٹائر کر دیا گیا تھا۔ آٹھ دس دن چھٹی دے کر ریٹائرمنٹ کی تاریخ آگے بڑھانے پر میں نے اعتراض کیا، کچھ اور لوگوں نے بھی۔ جنرل مشرف نے کراچی کور کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل مظفر عثمانی پر پورے بھروسے کا اظہار کیا، مگر لاہور کے بارے میں اتنے پُراعتماد نہ تھے۔

111 بریگیڈ کو تیاری کا حکم دے دیا گیا تھا۔ اس سلسلے میں کچھ خطوط بھی بریگیڈ ہیڈ کوارٹر سے یونٹوں کو لکھے گئے، جو کسی نے لا کر مجھے بھی دکھائے۔ اس بات پر میں نے ایک ایسی ہی میٹنگ میں جنرل مشرف کے سامنے نکتہ چینی بھی کی کہ بات اس طرح کھول کر نہ کی جائے کہ باہر نکل جائے۔ ظاہر ہے خط کسی کلرک نے ٹائپ کیا ہوگا، پھر کسی کلرک نے کھولا ہوگا، یونٹ کی ڈاک میں ایڈجوٹنٹ صاحب نے دیکھا ہوگا۔ سب کو خبر پھیل چکی ہوگی۔ مگر میری شکایت ٹال دی گئی۔ جنرل محمود بعد میں ناراض بھی ہوئے کہ میں نے یہ بات کیوں کہی۔ میری باتوں میں کوئی پوشیدہ پہلو نہ ہوتا اور میرے اس بچپنے سے لوگ خائف رہتے۔ میں نے تو ایک سازشی کے طور پر سازشیوں کے گروہ میں کھل کر بات کی۔ مقصد شکایت نہیں تھا۔ مگر آج اتنے دن گزر جانے کے بعد سوچتا ہوں کہ اس طرح کا خط لکھنا غلطی نہیں ہو سکتی۔ اتنی بیوقوفی کوئی نہیں کرتا۔ پھر کیا مقصد تھا، بات یوں کھولنے کا؟ شاید سوچا ہو کہ آئی ایس آئی کو یہ خبر ضرور پہنچے گی اور اس طرح وزیر اعظم صاحب کو بھی علم ہوگا کہ فوج انہیں ہٹانے والی ہے۔ اس کے ڈر سے نواز شریف صاحب فوج کے چیف کو ہٹانے کی کوشش کریں اور یوں فوج کو حکومت گرانے کا بہانہ مل جائے۔ کہہ نہیں سکتا، شاید صرف یہ میری سوچ ہی ہو۔

میں کب سے اس انتظار میں تھا کہ کوئی بہتر نظام اس ملک میں آئے جو غریب کے دکھ درد کا مداوا کرے۔ اس تمام عرصے میں ذرا خیال نہ آیا کہ میں کوئی غلط قدم اٹھانے لگا ہوں اور نہ ہی کسی قسم کا خوف دل میں اٹھا۔ آج پلٹ کر دیکھتا ہوں تو ہول اٹھتا ہے۔ جو کچھ بعد میں مشرف حکومت میں ہوا، اس کا اندازہ اس وقت میں نہیں لگا سکا تھا۔ خواب سے جاگنے میں دیر کر دی۔ کارگل پر جنرل مشرف کی غلط بیانیاں تو بہت بعد میں کھلیں اور اس وقت کون جانتا تھا کہ کس انجام پر وہ اس ملک کو پہنچائیں گے۔ ان دنوں جنرل مشرف کی باتوں کو دل کے اتنا قریب پایا اور ایسا یقین کیا، جیسے سب کچھ بدلنے ہی والا ہے۔ لگا ان سا مخلص اور کوئی نہیں۔

ہر فوجی کو اپنے کمانڈر پر پورا بھروسہ ہوتا ہے، یہی فوج کی طاقت ہے۔ پھر ان کی شخصیت ہی کچھ ایسی بھرپور تھی کہ ان کی باتوں کا یقین کرنے پر دل فوری آمادہ ہو جاتا۔ ان کی خوش اخلاق طبیعت، خود اعتمادی اور ولولہ انگیز شخصیت سے میں بہت متاثر تھا اور سمجھا کہ یہی پاکستان کے مسائل کا حل ہیں۔ جلد ہمیں ایک نیا نظام مل جائے گا، جس میں ہر ایک کو انصاف ملے گا۔ منصف اور ہمدرد حکمران ہوں گے۔ ملک بہاروں سے کھل اٹھے گا۔ سوچا اللہ ہی نے ایسے حالات پیدا کر دیئے ہیں۔ میرے لیے بہت فخر کی بات تھی کہ میں اس تبدیلی کا حصہ ہوں۔ میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس نے مجھے اس کام کے لیے چنا اور نہایت انہماک سے تیاریوں میں لگ گیا۔

جب فوجی حکومت کے نئے نئے دن تھے تو فیض صاحب کے امنگوں بھرے الفاظ، ''سب تاج اچھالے جائیں گے، ہم دیکھیں گے'' جگہ جگہ جہاں جنرل مشرف ہوتے قصیدے کے طور پر سنائی دیتے۔ وہ بھی اس پر خوب جھومتے اور حاضرین بھی۔ یہ سلسلہ بہت دنوں تک جاری رہا، پھر کچھ عرصے بعد، جب کچھ نہ بدلا، آہستہ آہستہ یہ نغمہ ایک طنز کی صورت اختیار کرتا گیا اور لوگوں نے جنرل مشرف صاحب کی تیوری دیکھ کر اسے بجانا بند کر دیا۔ آج پھر دل میں یہی ہوک اٹھتی ہے۔

پاکستان کے آئین پر میں نے بھی قسم اٹھائی تھی، مگر صرف میں نے ہی نہیں، تمام حکمرانوں اور ججوں نے بھی تو قسم اٹھائی تھی۔ ان میں سے تو کسی کو آئین کا کوئی پاس نہ تھا۔ سپریم کورٹ پر حملہ بھی کیا، کسی نے نہ پوچھا کہ آئین کہاں گیا؟ کیا چور بازاری کی آئین اجازت دیتا تھا؟ کیا سیاسی مفاد میں اپنے ہی لوگوں کا قتل عام آئین کا حصہ ہے؟ کیا عدالتوں میں ججوں کی خریداری آئین کے مطابق ہوتی ہے؟ کیا پولیس آئین کے مطابق عوام پر ظلم کرتی ہے؟ کیا عوام کا خون چوس کر جیبیں بھرنا میرے گناہ سے کم تھا، اس کی آئین میں اجازت تھی؟ کیا صرف میں ہی مجبور تھا کہ آئین کا پاس کرتا؟ کیا آئین کی اہمیت صرف حکمران کی کرسی بچانے تک ہے، جس کو ہلانے کی سزا موت لکھی گئی ہے؟ باقی ہر گناہ کی معافی ہے۔

یہ بدبودار نظام جمہوریت کا ایک تماشہ ہے، جس میں جمہوریت بچانے کے نام پر سب اپنے مفادات کے لیے ایک دوسرے کو تحفظ دیتے ہیں۔ صرف اپنی غرض پوری کرتے ہیں۔ کرسی قائم رہے، پیسہ بنتا رہے، عیاشی چلتی رہی، عوام بھاڑ میں جائیں۔ سیاستدان بھی، بڑے بڑے عہدوں پر فائز حکومت کے کارندے بھی، دولت سے لپٹے ہوئے وہ تمام ارباب اختیار بھی جو پیسے چباتے ہیں، مگر بھوک نہیں مٹتی اور صد افسوس کے ساتھ، لالچی دانشور بھی، سب ہی اس بھیانک کھیل میں شامل ہوتے ہیں۔ کچھ کہو تو سب ایسے کھڑے ہو جاتے ہیں جیسے آئین کی یہ کتاب آسمان سے اتری ہوئی کوئی پاک چیز ہو، بلکہ اس سے بھی اونچی۔ قرآن کو تو بس چوما اور رکھ دو، اس کے احکامات کی خلاف ورزی پر کوئی آواز نہیں اٹھتی اور اس نظام کو بنایا کس نے؟ ان ہی خود غرض سیاستدانوں نے، جنہوں نے اسے اپنے مفادات کو تحفظ دینے کے لیے ڈھالا، پھر قبر کے پتھر کی طرح قوم کو اس کے نیچے دبا دیا۔ مردوں کی سجدہ گاہ! سوچا اگر سولی چڑھوں گا تو شہید ہوں گا۔ (جاری ہے)

☆☆☆☆☆

قسط نمبر 4

مشرف کسی کو فوج کی کمانڈ سونپے بغیر سری لنکا چلے گئے تھے

اگر کوئی جھگڑا کھڑا ہوتا تو ملک میں آفت آجاتی - جنرل ضیا بٹ کو نیا آرمی چیف بنانے کی خبر سنتے ہی میں دفتر کی طرف بھاگا - 12 اکتوبر 1999ء کو میرے دفتر سے نکلے احکامات پر ملک میں فوجی حکومت قائم ہوئی - کیا علم تھا کہ قوم کی امیدوں کا خون ہوگا - لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کی کتاب سے اقتباسات

لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کا شمار افواج پاکستان کے مایہ ناز، بلند ہمت، باکردار اور اصول پسند افسران میں ہوتا ہے۔ انہیں جس قدر کامیابیاں حاصل ہوئیں، اس کی وجہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر مکمل یقین ہے۔ جہاں کہیں بھی وطن عزیز کے دفاع اور قومی مفادات کا معاملہ سامنے آیا، وہ حکمرانوں کے سامنے بڑی جرأت اور استقامت سے حاضر سروس جنرل ہوتے ہوئے بھی اختلافی رائے پیش کرتے رہے۔ ڈائریکٹر جنرل تجزیاتی ونگ کی حیثیت سے کارگل کے محاذ کے حوالے سے انہوں نے ہمیشہ حقیقت پسندانہ تجزیہ اعلیٰ فوجی حکام کو مہیا کیا۔ نائن الیون (11/9) کے بعد امریکہ کیلئے فوجی سہولتوں کی فراہمی کے معاملے پر بھی اعلیٰ سطحی فوجی اجلاس میں کھل کر کلمہ حق بلند کیا۔ ان کی ملازمت کا عرصہ فیض کے اس مصرعے کی عملی تفسیر رہا:

جو رکے تو کوہِ گراں تھے ہم، جو چلے تو جاں سے گزر گئے

لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کی اجازت سے، ان کی کتاب "یہ خاموشی کہاں تک" سے منتخب اقتباسات قارئین کی معلومات اور دلچسپی کے لیے پیش کیے جا رہے ہیں۔

"سر، جلدی ٹی وی لگائیں، دیکھیں کیا آ رہا ہے، جنرل ضیا کو نیا آرمی چیف بنا دیا گیا ہے"۔ MO سے ایک کرنل صاحب کا فون تھا۔ اکتوبر کی بارہ تاریخ 1999ء کی شام، تقریباً پانچ بج رہے تھے، میں ابھی دفتر سے گھر پہنچا ہی تھا۔ گیسٹ روم سے نکل کر اپنے نئے گھر میں آئے ہوئے ہمیں شاید دو یا تین روز ہوئے تھے، سامان بھی پورا نہیں کھلا تھا۔ سوٹ کیسوں کو پھلانگتا ہوا فوراً ہی واپس دفتر کی طرف بھاگا۔ جاتے ہوئے انجم سے کہا "گیٹ بند کروا لو اور ہاں، میرا لیپ ٹاپ (laptop computer) بھائی کے گھر بھجوا دو"۔ اس میں حکومت کا تختہ الٹنے کی ساری تفصیلات پر کام کیا تھا۔ نہ جانے آج کیا ہوگا۔ اگر ناکام رہا تو......، "شاید آنے میں دیر ہو جائے...... کہہ نہیں سکتا کتنی"۔ انجم ان تمام باتوں سے ناواقف تھی۔ میں نے کبھی اُسے اپنے کام میں نہیں اُلجھایا۔ دفتر کے پیچ و خم سے ناواقف ہی رہتی۔ مگر آج مجھے اس تیزی سے نکلتے دیکھ کر کچھ پریشان سی ہوگئی۔ گھبراتی تو وہ نہیں تھی، پھر اتنا عرصہ ساتھ رہ کر کچھ انجانے حالات کا سامنا کرنے کا حوصلہ بھی ہو گیا تھا۔ کچھ پوچھ رہی تھی، لیکن میں نکل چکا تھا۔ یہی ہوگا کہ کھانے پر آجائیں گے نا؟ گھر پر کوئی گارڈ نہیں رکھتا تھا، اس وقت خیال آیا کہ ان دنوں رکھنی چاہیے تھی۔

گاڑی لے کر سڑک پر نکلا تو اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔ مجھے خوف ہوا کہ راستے میں روک نہ لیا جاؤں۔ اگر جنرل ضیا کا اندازہ تھا کہ فوج حکومت کا تختہ الٹنا چاہتی ہے تو اس موقع پر فوج کا ردِعمل لازم تھا اور یہی موقع تھا کہ کارروائی کو روکا جا سکے۔ ان دنوں ISI کے پاس SSG کی کافی سپاہ ہوتی تھی۔ تین لوگوں کو ہی تو روکنا تھا۔ 9/11 سے پہلے گارڈ ساتھ لے کر چلنے کا رواج بھی نہ تھا، آسانی سے سارا معاملہ ٹھپ کیا جا سکتا تھا۔ مگر کوئی رکاوٹ کہیں نہ ملی۔ جنرل عزیز اور جنرل محمود بھی ایک ساتھ ٹینس کھیل رہے تھے، وہیں ٹھہرائے جا سکتے تھے۔ حکومت کو اس ردِعمل کی توقع ضرور تھی، کیونکہ اسلام آباد میں جگہ جگہ پولیس تعینات کی گئی تھی اور پولیس کی بکتر بند گاڑیاں سڑکوں پر کھڑی تھیں۔ ہم نے بھی بے وقوفی کی کہ گارڈ نہ رکھی اور ان کے ہاتھ سے بھی سنہری موقع نکل گیا۔ جتنا بھی سوچو، کچھ نہ کچھ رہ ہی جاتا ہے۔ اللہ ہی جدھر چاہے پورا کرتا ہے۔

دفتر پہنچ کر جنرل عزیز کو فون کیا، پتا چلا کہ جنرل محمود 111 بریگیڈ کو "گو" (go) دے چکے ہیں۔ کہنے لگے تم باقی جگہوں پر کارروائی شروع کرواؤ، میں دفتر پہنچ رہا ہوں۔ سب سے اہم مسئلہ تو اسلام آباد اور راولپنڈی کا ہی تھا، ان میں ہونے والی کارروائیوں کو مانیٹر (monitor) کرنا تھا۔ صدر اور وزیر اعظم کے گھروں اور دفتروں کے علاوہ، ٹیلیفون ایکسچینج اور ان کا سارا مواصلاتی نظام، موبائل ٹیلیفون کا نظام، ٹی وی اور ریڈیو اسٹیشن، ہوائی اڈہ، ریلوے اسٹیشن، بجلی کا نظام، شہر سے آنے جانے کے راستے اور ایسی اور مختلف اہم چیزوں کو بھی اپنے قابو میں کرنا تھا۔ فوج کے بھی مواصلاتی نظام کو دیکھنا تھا۔ ان سب کارروائیوں پر نظر رکھنی ضروری تھی۔ پہلے سے تمام کو احکام تو دیئے نہیں تھے کہ سب اپنا اپنا کام جانتے ہوں۔ ایک ایک کو بتانا تھا، ہر لمحے کی خبر رکھنی تھی۔

جب جنرل عزیز میرے دفتر پہنچے تو انہوں نے کہا کہ کراچی کے کور کمانڈر سے میں خود بات کر لوں گا، آپ باقی چیزوں کو سنبھالیں۔ یہ کہہ کر اپنے دفتر چلے گئے۔ کچھ دیر بعد لوٹے اور پھر میرے پاس ہی بیٹھ گئے۔ کبھی اٹھ کر چلے جاتے، پھر کچھ دیر میں واپس آجاتے۔ اس طرح ان کو بھی خبر رہتی، کیونکہ سارا کام MO سے ہی ہو رہا تھا۔ میرے پاس فوج کا سب سے بہترین اسٹاف تھا، جو ذرا نہ چوکتا۔

جنرل مشرف سری لنکا سے چل چکے تھے، جہاز کراچی کی طرف پرواز میں تھا۔ ملیر کے ڈویژن کمانڈر میجر جنرل افتخار خان کو فون کیا، حالات بتائے اور کہا کہ فوراً ایئرپورٹ پہنچیں اور اُس کا کنٹرول سنبھال لیں، جنرل مشرف کا جہاز آنے والا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ابھی ایئرپورٹ پہنچتے ہیں۔

لاہور فون کیا تو پتا چلا کہ کور کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل خالد مقبول غیر حاضر ہیں۔ ڈھونڈنے پر پتہ چلا کہ گوجرانوالہ گالف کھیلنے گئے ہوئے ہیں۔ کور کمانڈر جب بھی اپنے علاقے سے باہر جاتے ہیں، CGS کو لازماً خبر ہوتی ہے، لیکن آج کسی کو اُن کی لاہور سے غیر حاضری کا پتا نہیں تھا۔ گالف کورس میں بھی وہ کافی دیر نہ مل سکے۔ میجر جنرل طارق مجید (بعد میں جنرل بنے اور چیئرمین جوائنٹ چیف آف اسٹاف کمیٹی تعینات ہوئے) کو فون کیا، جو لاہور میں ڈویژن کمانڈ کر رہے تھے۔ ان کو تمام احکامات دیئے اور کہا کہ آپ کور کمانڈر کے آنے تک کور کی کمانڈ سنبھال لیں۔ قابل اور بھروسے والے افسر تھے اور انہوں نے نہایت حوصلے اور خوش اسلوبی سے لاہور کو سنبھالا۔

کوئٹہ میں کور کمانڈر پر تو بھروسہ رہا نہیں تھا۔ دو ڈویژن کمانڈر تھے، دونوں ہی غیر حاضر اور تمام حالات سے بے خبر تھے۔ پتا چلا کہ دونوں کور کمانڈر کے ساتھ اُن کے دفتر میں بیٹھے ہیں۔ میٹنگ چل رہی ہے۔ یقیناً کور کمانڈر کو پتا تھا کہ کیا ہونے والا ہے، اسی لیے انہوں نے دونوں جنرلوں کو اپنے پاس ہی رکھا کہ ان کو کوئی احکامات نہ مل سکیں۔ بعد میں پتا چلا کہ جنرل TP ٹی وی دیکھتے رہے اور لگاتار لوگوں سے فون پر حالات پوچھتے رہے۔ کوئی چارہ سمجھ نہ آیا۔ پھر ایک بریگیڈ کمانڈر بریگیڈیئر غضنفر (بعد میں میجر جنرل بنے) جو میرے کورس میٹ تھے، لیکن ابھی پروموٹ نہیں ہوئے تھے، ان سے بات کی اور صورت حال بتائی۔ ان کو بتایا کہ دونوں ڈویژن کمانڈروں کو کور کمانڈر نے اپنے دفتر میٹنگ کے بہانے بٹھایا ہوا ہے اور اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں کہ اب یہ تمام کام آپ ہی کریں۔ انہوں نے حامی بھری، پھر کوئٹہ کو سنبھالا بھی۔

پشاور کے کور کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل سعید الظفر کے بارے میں جنرل مشرف اتنے پُراعتماد نہیں تھے۔ جب وہ سری لنکا جا رہے تھے، تو آخری ملاقات میں یہ مسئلہ سامنے آیا کہ ان کے جانے پر فوج کی کمانڈ سونپنے کے بارے میں کیا کیا جائے۔ اصولی طور پر جب بھی چیف باہر جاتے ہیں، فوج کی کمانڈ سب سے سینئر کور کمانڈر کو دی جاتی ہے۔ فوج کی ہر سطح پر یہی دستور ہے کہ نچلے کمانڈروں میں سب سے سینئر کو کمانڈ سونپی جائے۔ کبھی کمانڈ سونپے بغیر کمانڈر اپنی سپاہ کو نہیں چھوڑتا۔ اب پشاور کور کمانڈر کو ایسے موقع پر فوج کی کمانڈ دینے پر وہ رضامند نہ تھے، اس لیے بغیر کسی کو کمانڈ سونپے چلے گئے۔ کہہ دیا تھا کہ اس مسئلے کو نہ اٹھاؤ۔ اگر ان کی غیر حاضری میں کوئی جھگڑا کھڑا ہو جاتا تو ملک میں آفت آجاتی۔ فوج بغیر کمانڈر کے تھی۔ جنرل عزیز نے مجھ سے کہا کہ آج بھی ان سے بات نہ کروں اور پشاور کو اس کارروائی سے باہر ہی رہنے دوں۔

پھر راولپنڈی کے اردگرد دفاعی سپاہ بھی تعینات کرنی تھی۔ یہ تو نہیں پتا تھا کہ پشاور یا کھاریاں کی سمت سے کوئی دخل اندازی ہوگی یا نہیں۔ وہاں بہت مضبوط سپاہ موجود تھیں۔ سب تو اس منصوبے میں پہلے سے شامل تھے نہیں، کیا پتا تھا ان کی وفاداریاں کس سمت بیٹھیں۔ مسئلہ صرف فوج اور سول حکومت کا نہیں تھا، فوج کا ایک نیا سربراہ تعینات ہو چکا تھا، جو ISI جیسے ادارے کا سربراہ تھا اور فوج میں اس کی عزت تھی، اثر و رسوخ رکھتا تھا۔ پھر اس مسئلے کی کھچڑی دونوں جانب سے کئی دنوں سے پک رہی تھی۔ نہ جانے کون کدھر تھا۔ راولپنڈی میں تو ایک ہی بریگیڈ تھا، جو اسلام آباد کی نذر ہو گیا۔ ضرورت کے تحت 10 کور کا ڈویژن منگلا سے منگوایا، جس کی کمانڈ میجر جنرل عارف حسن (بعد میں لیفٹیننٹ جنرل بنے) کر رہے تھے۔ یہ سپاہ کھاریاں اور پشاور سے مداخلت کی صورت میں، یقیناً ناکافی تھی، خدانخواستہ اگر ایسا مسئلہ اٹھ جاتا کہ فوج آپس میں اُلجھ جاتی، تو تباہ ہو جاتی۔ بس صرف ایک ایسی صورت حال پیدا کرنی تھی کہ مداخلت کرنے والا سوچے کہ مداخلت کا فوج کے لیے کیا انجام ہو سکتا ہے اور باز رہے۔

اسلام آباد میں پرائم منسٹر اور پریذیڈنٹ ہاؤس گھیرے میں لیے جا چکے تھے۔ پھر میں نے پریذیڈنٹ ہاؤس کی بٹالین سے ایک میجر صاحب، کچھ سپاہ کے ساتھ ٹی وی اسٹیشن کو کنٹرول میں لینے کے لیے بھیجے تاکہ وہاں سے جو لگاتار نئے چیف کو رینک کے بیج لگانے کی ویڈیو چل رہی تھی اُسے بند کروایا جائے۔ تب یہ سلسلہ بند ہوا۔ مگر کچھ دیر میں پھر ٹی وی اسٹیشن سے جنرل ضیا اور نواز شریف کی ویڈیو چلنی شروع ہوگئی۔ میں نے جب پتا کیا تو بتایا گیا کہ ٹی وی اسٹیشن پر تو ہمارا کنٹرول ہو چکا ہے، نہ جانے کیا مسئلہ ہے۔ اتنا بڑا اسٹیشن ہے، ہو سکتا ہے کنٹرول روم نہ مل رہا ہو یا کوئی اور مسئلہ پیش ہو۔ میں نے کہا اگر ان سے ٹی وی اسٹیشن نہیں سنبھالا جاتا تو اُسے بند کروا دو۔ ابھی وقت نہیں تھا کہ میں اس مسئلے میں الجھتا۔ جب ٹی وی اسٹیشن پر بھیجے ہوئے افسر سے کوئی رابطہ نہ ہو سکا تو انہوں نے ایک اور افسر کے ساتھ کچھ سپاہی یہ حکم دے کر بھجوائے کہ ٹی وی کی نشریات بند کر دی جائیں۔

جب ٹی وی پر نواز شریف صاحب کی ویڈیو چلنی بند ہوئی، تو انہوں نے بریگیڈیئر جاوید اقبال کو بھیجا، جو PM کے اسٹاف افسر تھے کہ دیکھ کر آئیں کیا مسئلہ ہے۔ جب وہ وردی میں وہاں پہنچے تو وہاں موجود میجر صاحب نے انہیں سیلوٹ کیا اور دستور کے مطابق اپنی کارروائی کی رپورٹ دی، بتایا کہ میں نے نئے چیف کی ویڈیو بند کروا دی ہے۔ انہوں نے سمجھا بریگیڈیئر صاحب ان کے ہی ساتھ ہیں۔ بریگیڈیئر صاحب نے انہیں پھسلا کر ان کا ہتھیار لے لیا اور تمام سپاہ کو ہتھیار لینے کے بعد ایک کمرے میں کیا اور باہر سے دروازہ بند کر کے تالا لگا دیا۔ ٹی وی والوں کو حکم دیا کہ وہی ویڈیو چلاتے رہیں اور اعلان کرتے رہیں کہ نیا آرمی چیف لگایا جا چکا ہے اور ٹی وی اسٹیشن کے گیٹ پر بھی تالا لگا کر واپس PM ہاؤس چلے گئے۔ وہاں گیٹ پر موجود سپاہیوں نے نہ ہی انہیں باہر جانے سے روکا اور نہ ہی واپسی پر۔ پھر جب اور سپاہی ٹی وی اسٹیشن پہنچے تو انہوں نے آ کر دوبارہ ٹی وی اسٹیشن کا کنٹرول سنبھالا اور بند کمرے سے اپنے ساتھیوں کو نکالا۔ جو ٹی وی پر سپاہیوں کی گیٹ پھلانگتے ہوئے تصویریں دکھائی جاتی تھیں وہ ان ہی کی تھیں۔ کچھ ہی دیر میں ٹی وی اسٹیشن بند کر دیا گیا۔ مجھے یہ کہانی بہت بعد میں پتا چلی، ورنہ ٹی وی کی نشریات بند نہ کرواتا۔ لیکن اس وقت بڑے اہم اور ارجنٹ (urgent) مسئلے تھے، نہ کہ ٹی وی اسٹیشن۔ کراچی میں ایئرپورٹ کی کوئی خبر نہیں مل رہی تھی اور وقت کم رہ گیا تھا۔

ایک اور پریشان کن خبر یہ تھی کہ کھاریاں میں کچھ ٹینکوں اور بکتر بند گاڑیوں پر مبنی سپاہ کو اسلام آباد جانے کے لیے تیار رہنے کے احکامات دیئے گئے ہیں۔ راولپنڈی میں ان کے مقابلے کی سپاہ موجود نہیں تھیں۔ اس ممکنہ پیچیدگی کے لیے بھی دفاعی اقدامات کرنے تھے۔ کھاریاں کی یہ سپاہ رات دیر تک تیار ہی رہی اور ایک مرتبہ گاڑیوں میں بھی بیٹھ گئی، مگر یہ چلے نہیں۔ ہمارے لیے رات گئے تک پریشانی کا سبب رہے۔ پھر جب جنرل مشرف کا جہاز خیریت سے اُتر گیا اور PM صاحب حراست میں لے لیے گئے تو کچھ دیر بعد یہ بھی آرام سے بیٹھ گئے۔

خبر ملی کہ کراچی ایئرپورٹ پر اب تک فوج نہیں پہنچی اور جنرل مشرف کا جہاز قریب پہنچ رہا ہے۔ دوبارہ ملیر فون کیا، پھر ڈویژن کمانڈر نے یہی کہا کہ ابھی ہم ایئرپورٹ پہنچتے ہیں۔ وقت کم تھا۔ بریگیڈیئر جبار بھٹی کو، جو بہت باہمت اور حوصلے والے افسر تھے (میجر جنرل بنے) اور ملیر میں ایک بریگیڈ کمانڈ کر رہے تھے، ایئرپورٹ کی طرف بھیجا اور وہ فوراً ہی پہنچ گئے۔ چونکہ پہلے سے تیاری نہیں تھی اس لیے پرانے ایئرپورٹ کے کنٹرول ٹاور پر جا نکلے۔ پھر وہاں سے نئے کی طرف چلے۔

رن وے کی تمام بتیاں بند تھیں اور اس پر آگ بجھانے والی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ایئر ٹریفک کنٹرول (ATC) میں پہنچے تو پتا چلا کہ جہاز نوابشاہ کی طرف جا رہا ہے۔ جب میں نے نوابشاہ سے پتا کیا تو انٹیلی جنس والوں نے رپورٹ دی کہ پولیس کی بھاری نفری ایک DIG کی قیادت میں ایئرپورٹ پر جنرل مشرف کو اپنی تحویل میں لینے کے لیے موجود ہے۔ بریگیڈیئر جبار بھٹی سے کہا کہ جہاز کو فوراً واپس کراچی کی طرف موڑیں اور رن وے کو خالی کروائیں۔ پائلٹ پہلے تو آمادہ نہیں تھا، کہنے لگا کہ بمشکل کراچی پہنچ سکتا ہوں۔ اسے کہا کہ فوراً جہاز کو واپس موڑ دو۔ نہایت تناؤ (tense) کے لمحے تھے۔ نہ جانے کراچی ایئرپورٹ پر سپاہ کے پہنچنے میں دیر کیوں ہوئی؟ پھر جنرل افتخار بھی پہنچ گئے اور انہوں نے ہوائی جہاز میں بیٹھے جنرل مشرف سے رابطہ کیا۔ چند منٹ ہی کا فرق تھا، ورنہ جہاز گر کر تباہ ہو جاتا۔ پائلٹ کا ہی حوصلہ تھا جو اس نے اتنا بڑا قدم اٹھایا۔ جب جہاز اتر گیا تو سب کی جان میں جان آئی۔ کراچی کے کور کمانڈر جنرل مشرف کو لینے ایئرپورٹ پہنچے ہوئے تھے۔

وقت ایسا تھا کہ جگہ جگہ لوگ غائب تھے۔ کچھ نے تو جب خبر سنی، دبک کر بیٹھ رہے۔ سوچا دیکھتے ہیں اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ کئی جگہوں پر تو جب متعلقہ افسر کو بتا دیا اور اس نے حامی بھی بھر لی، ہمیں تسلی بھی دے دی، پھر بھی اپنی جگہ سے ہلا نہیں۔ انتظار میں رہا کہ وفاداریاں کہاں دکھلاؤں۔ ایسے موقعوں پر پتا چلتا ہے کہ انسانی وفاداریاں کیسے بدلتی ہیں۔

جب وزیر اعظم کے گھر لگی پلٹن کے CO کرنل شاہد علی (بریگیڈیئر بنے) پرائم منسٹر ہاؤس کے گیٹ کے اندر گئے تو وہاں جنرل ضیاالدین کی گاڑی چار ستاروں اور چیف کے جھنڈے کے ساتھ کھڑی تھی۔ یہیں انہیں چیف کے رینک لگی وردی میں جنرل ضیا، وردی میں لیفٹیننٹ جنرل اکرم اور بریگیڈیئر جاوید کچھ اور ساتھیوں کے ہمراہ ملے۔ ان کے ساتھ ہتھیاروں سمیت گارڈ بھی تھی۔ کرنل شاہد علی نے مجھے بعد میں بتایا کہ ان دونوں نے پہلے تو انہیں ڈرایا دھمکایا، پھر لالچ دی کہ تم فکر نہ کرو ایسے موقعے پر انسان سے فیصلہ کرنے میں غلطی ہو جاتی ہے، ہم تمہارا خاص خیال رکھیں گے۔ پھر جب وہ نہ مانے تو یہ بھی کہا کہ ابھی کچھ دیر میں پشاور سے سپاہ پہنچ جائے گی، تو تم لوگوں کا یہ سارا ڈرامہ دھرا کا دھرا رہ جائے گا اور تم بہت خسارے میں رہو گے۔ پھر یہاں موجود سپاہ نے ان پر ہتھیار تان لیے اور کہا گیا کہ اپنی پلٹن کے لوگوں کو فوراً گیٹ سے ہٹ جانے کا حکم دو اور نئے چیف کو GHQ پہنچنے دو، ورنہ تمہاری خیر نہیں۔ کرنل صاحب نے جواب دیا کہ اگر گولی چلائی تو میرے جوانوں نے پورا گھر گھیرے میں لیا ہوا ہے، کسی کی بھی خیر نہیں ہوگی۔ اس نوجوان افسر کا حوصلہ تھا کہ یہ یوں اکیلے کھڑا رہا۔ پھر باقی سب گھر کے اندر چلے گئے۔

کچھ دیر پہلے جنرل محمود بھی میرے دفتر میں آ چکے تھے اور ان کے ساتھ میجر جنرل عارف حسن بھی۔ میرے دفتر میں بیٹھے جنرل عزیز سے بات کرتے رہے، پھر جنرل محمود اور عارف حسن اٹھ کر وزیر اعظم اور ان کے ساتھیوں کو تحویل میں لینے چلے گئے۔ رات کے ڈھائی بجے جنرل مشرف نے SSG کی وردی پہن کر، ملک کے نئے سربراہ کی حیثیت سے ٹی وی پر قوم سے خطاب کیا۔ اللہ کا کرنا ہے کہ آج، جب میں یہ لکھ رہا ہوں، 12 اکتوبر 2011ء ہے۔ بارہ سال ہو گئے اُس دن کو جب میرے دفتر سے نکلے ہوئے احکامات پر ملک میں فوجی حکومت قائم ہوئی۔ ہم سب نے چین کا سانس لیا تھا۔ سڑکوں پر لوگ نکل کر ناچ رہے تھے، مٹھائیاں بانٹی گئیں۔ کیا علم تھا کہ ہم راہ ہی میں کھو جائیں گے، قوم کی امیدوں کا خون ہوگا۔ (جاری ہے)

☆☆☆☆☆
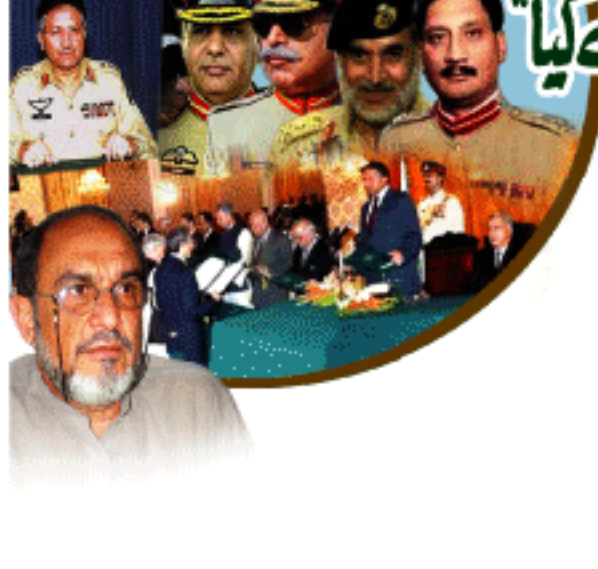
"مشرف کابینہ کے ارکان کا چناؤ جنرل عزیز جنرل احسان نے کیا"

وزارت داخلہ-خارجہ-اطلاعات اور مالیاتی اداروں سے متعلق لوگ پہلے ہی چنے جا چکے تھے-فوج کے سینئر افسران کی اہم جگہوں پر تبدیلیوں سے اختلافات شروع ہوئے مشرف نے کراچی سے آتے ہی قریبی ساتھیوں سے خفیہ میٹنگز شروع کردی تھیں-ان اجلاس سے مجھے باہر رکھا جاتا تھا-لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کی کتاب سے اقتباس

لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کا شمار افواج پاکستان کے مایہ ناز، بلند ہمت، با کردار اور اصول پسند افسران میں ہوتا ہے۔ انہیں جس قدر کامیابیاں حاصل ہوئیں، اس کی وجہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر مکمل یقین ہے۔ جہاں کہیں بھی وطن عزیز کے دفاع اور قومی مفادات کا معاملہ سامنے آیا، وہ حکمرانوں کے سامنے بڑی جرأت اور استقامت سے حاضر سروس جنرل ہوتے ہوئے بھی اختلافی رائے پیش کرتے رہے۔ ڈائریکٹر جنرل تجزیاتی ونگ کی حیثیت سے کارگل کے محاذ کے حوالے سے انہوں نے ہمیشہ حقیقت پسندانہ تجزیہ اعلیٰ فوجی حکام کو مہیا کیا۔ نائن الیون (11/9) کے بعد امریکہ کیلئے فوجی سہولتوں کی فراہمی کے معاملے پر بھی اعلیٰ سطحی فوجی اجلاس میں کھل کر کلمہ حق بلند کیا۔ ان کی ملازمت کا عرصہ فیض کے اس مصرعے کی عملی تفسیر رہا:

جو رکے تو کوہِ گراں تھے ہم، جو چلے تو جاں سے گزر گئے

لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کی اجازت سے، ان کی کتاب "یہ خاموشی کہاں تک" سے منتخب اقتباسات قارئین کی معلومات اور دلچسپی کے لیے پیش کیے جا رہے ہیں۔

"تم وہ بات جنرل مشرف کو بتاؤ نا، جو مجھ سے کہہ رہے تھے" ہمارے دوست نے کہا۔ میں چونک پڑا اور کہا نہیں وہ تو ویسے ہی ایک خدشے کا آپ سے ذکر کیا تھا، کوئی مستند بات تو نہیں۔ جنرل مشرف نے کہا "نہیں نہیں بتاؤ"۔ تو میں نے کہا کہ سینئر افسران کے تبادلے اپنے ہی ہاتھ میں رکھیں تو بہتر ہوگا۔ کہنے لگے کیا تم کہہ رہے ہو کہ میرے ساتھی اعتبار کے لائق نہیں؟ میں نے کہا میرا ہرگز یہ مطلب نہیں، مگر ان کے جملے نے مجھے عجیب رنگ میں ڈھال دیا تھا۔ کہنے لگے "نہیں یہ بہت اچھے لوگ ہیں، تم غلط سمجھتے ہو۔ آخر کن وجوہات پر تم نے یوں سوچا؟" اصرار کرنے لگے کہ میں اپنی صفائی پیش کروں، کچھ ناراضگی بھی چہرے پر آ گئی۔ میرے پاس تو کوئی ایسی بات ہی نہیں تھی، کیا کہتا۔ میں تو ایک اصولی سی بات کر رہا تھا۔ فوجی حکومت کو آئے ابھی کچھ ہی دن گزرے تھے کہ جنرل مشرف نے مجھے اور انجم کو کھانے پر اپنے گھر بلایا۔ ایک اور صاحب بھی مدعو تھے، جو ہم دونوں کے قریب تھے۔ ہم پہلے ان کے گھر چلے گئے۔ کچھ دیر وہاں بیٹھے۔ ان صاحب کے پوچھنے پر کہ کیا ہو رہا ہے، میں نے کہا، میں بھی وہی جانتا ہوں جو آپ اخبار میں پڑھتے ہیں۔ بہت حیران ہوئے۔ کہنے لگے تم معاملات میں شامل رہا کرو، جنرل مشرف کو یوں تنہا نہ چھوڑو۔ میں نے کہا کہ کوئی ایسی پریشانی کی بات نہیں، مگر ایک بات ہے جس کا جنرل مشرف کو خیال رکھنا چاہیے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جہاں تک فوج کے سینئر افسران کی تعیناتی کا سوال ہے، جنرل مشرف کو یہ سلسلہ اپنے ہاتھ ہی میں رکھنا چاہیے۔ یہ بات مجھے ذرا پریشان کرتی ہے۔ پھر ہم اٹھ کر آرمی ہاؤس چلے گئے۔ کھانے کے بعد جب بیٹھے تو پاکستان کے بارے میں بات چیت شروع ہوگئی۔ اس دوران ہمارے دوست نے اچانک مجھے یہ کہہ کر چونکا دیا کہ یہ بات جنرل مشرف کو بھی بتاؤں۔ پھر جنرل مشرف کی آنکھوں سے جھلکا کہ انہوں نے میری باتوں سے کچھ اور ہی سمجھا، جو میں کہہ نہیں رہا تھا۔

ہاں، اتنا ضرور تھا کہ حکومت کا تختہ الٹنے کے بعد تمام معاملات سے مجھے باہر رکھا جاتا، جو مجھے اچھا نہیں لگتا تھا کہ آخر مجھے ہی کیوں اس اعتبار کے دائرے سے باہر رکھا جاتا ہے۔ سوچا شاید اس لیے کہ میں کھری بات سب کے سامنے کہہ دیتا ہوں، سچ اجاگر کر دیتا ہوں، جیسے سری لنکا جانے سے پہلے کی ایک ملاقات میں تختہ الٹنے کی تیاری کا خط لکھنے پر کیا تھا، جس پر سب ہی خفا تھے۔ شاید ناموزوں سوالات بھی پوچھتا ہوں اور شاید جنرل محمود اور جنرل عزیز نہیں چاہتے تھے کہ میری موجودگی سے جنرل مشرف اُن چھوٹی چھوٹی باتوں میں الجھ جائیں جن سے اُن کو ناواقف رکھنا ہی بہتر ہو۔ شاید میری موجودگی کچھ ایسے مسائل پیدا کرتی ہو۔ میں نے جنرل مشرف یہی کہہ دیا کہ میں ہر حکومتی معاملے سے باہر رہتا ہوں، شاید اس وجہ سے مجھے یہ خیال آیا ہو۔ اب اتنے اصرار پر اور کیا جواب دیتا؟ انہوں نے عجیب طرح سے مجھے دیکھا۔ پھر ہم سب اٹھ کر آ گئے۔

مجھے یوں محسوس ہوا، جیسے انہوں نے سوچا ہو کہ میں یہ باتیں کہہ کر اپنی مخصوص وفاداریاں دکھانا چاہتا ہوں، تاکہ ان کے قریب آ سکوں۔ اس سوچ سے مجھے سخت کوفت ہوئی اور شاید اس دن سے قدرتی طور پر میرا رویہ کچھ اس طرح کھنچا ہوا ہو گیا کہ اُن پر یہ بات واضح ہو جائے کہ میں اتنا گرا ہوا نہیں جتنا انہوں نے سمجھا۔ شاید میں اپنے خلوص پر یہ دھچکا برداشت نہ کر پایا۔ شاید میری انا پھر آڑے آ گئی۔ کہہ نہیں سکتا کہ میری اس فطری کمزوری کا ہمارے بیچ تناؤ میں کتنا دخل رہا، مگر یہ تناؤ کبھی ختم نہ ہوا۔ چھپا رہا، بڑھتا رہا۔ ہر ملاقات میں کوئی نہ کوئی ایسی بات ہوتی جو انڈر کرنٹس (under currents) چھوڑ جاتی۔ مگر میں نے ہمیشہ ہی سچائی سے ان کا ساتھ دیا، کبھی کسی بات پر انہیں دھوکے میں نہیں رکھا اور نہ ہی کوئی ڈھکی چھپی بات کی۔ جب تک ان کا ساتھی تھا، ساتھ دیا، آخری دن تک۔ جو غلط سمجھا، نہیں کیا۔ جو کہنا تھا صاف کہا۔

ان دنوں جنرل مشرف بہت پر عزم دکھائی دیتے اور میں سمجھتا ہوں کہ یقیناً وہ قوم کے آنسو پونچھنا چاہتے تھے، چیزوں کو بدلنا چاہتے تھے اور اس کی صلاحیت اور طاقت بھی رکھتے تھے۔ میں کہہ نہیں سکتا، کیا رکاوٹیں اور مسائل پیش آئے کہ یہ سب کچھ ہو نہ سکا۔ ان باتوں کو شاید وہ ہی سمجھ سکتا ہے جس نے یہ بھاری ذمہ داری اٹھائی ہو۔ میرا باہر سے بیٹھ کر تنقید کرنا آسان ہے۔ انہوں نے بہت خلوص اور لگن سے کام شروع کیا اور بہت سے مسائل پر جلد قابو پا لیا۔ اس ملک کو بہت کچھ دیا۔ پھر بھی، میں اُن چند اسباب کا ذکر ضرور کرنا چاہوں گا جن سے میرے وجود میں لپکتے شعلے سرد ہوئے، امیدیں خاک میں ملیں۔ جنرل مشرف کے کراچی سے آتے ہی، قریبی ساتھیوں کے ساتھ اُن کی متواتر میٹنگز شروع ہو گئیں۔ صبح سے رات دیر گئے تک یہ سلسلہ جاری رہتا۔ ان میٹنگز میں شامل ہوتے لیفٹیننٹ جنرل محمود (جو DGISI تعینات ہوئے)، لیفٹیننٹ جنرل عزیز (CGS)، جنرل غلام احمد (چیف آف اسٹاف-COS، جو GA کہلاتے تھے، ہر دل عزیز انسان تھے، اللہ انہیں جنت نصیب کرے۔ ہم ISI میں اکٹھے رہے تھے)، میجر جنرل احسان (DGMI)، بریگیڈیئر راشد قریشی (DGISPR) اور طارق عزیز صاحب (اُن کے پرنسپل سیکریٹری)۔ میں GHQ ہی میں رہتا اور کچھ علم نہ ہوتا کہ کیا ہو رہا ہے۔ بس وہی جانتا جو اخباروں میں پڑھتا۔ اس عرصے میں کیبنٹ (cabinet) کے لیے لوگوں کا چناؤ بھی شروع ہو گیا۔ انٹرویو جنرل عزیز کے دفتر میں ہوتے، جن میں جنرل احسان موجود ہوتے اور عموماً جنرل محمود، جنرل GA یا طارق عزیز صاحب بھی آ جاتے۔ میں باہر ہی رہتا۔ پھر کچھ فوج کے سینئر افسران کی اہم جگہوں پر تبدیلیاں ہوئیں، جن کے بارے میں مجھے علم ہوا کہ یہ جنرل محمود اور جنرل عزیز نے کروائیں۔ اس ہی پر نکتہ چینی سے جنرل مشرف کے ساتھ تناؤ شروع ہوا۔ اُس رات کے بعد دوسرے دن جب کیبنٹ کے انٹرویو ہونے لگے تو جنرل عزیز نے مجھے بھی بلوا لیا۔ یقیناً جنرل مشرف نے کچھ کہا ہوگا۔ باتوں باتوں میں کہنے لگے، ہم سب ہی ملک کے کاموں میں بہت مصروف رہتے ہیں، اس لیے تمہیں GHQ میں چھوڑ جاتے ہیں تاکہ تم فوج کو سنبھالے رہو (somebody to hold the fort)۔ ہم دونوں میں بہت اچھا تعلق تھا اور مجھے اُن کے خلوص پر ذرا شک نہ تھا، میں کیا کہتا۔ بس اُس رات یوں ہی تقدیر کے ہاتھوں الجھ گیا تھا، حالانکہ کچھ کہنے کو نہیں تھا۔ زندگی بے ترتیب سی ہی چلتی ہے، جیسے نیم تاریکی میں پتھریلی ڈھلوان پر، ٹھوکریں کھاتے۔ سمجھتا ہوں کہ اختیار رکھتا ہوں، مگر کسی لمحے پر بھی قادر نہیں۔ کیبنٹ کے لیے انٹرویو میرے لیے ایک عجیب سا تماشا تھے۔ اچانک فون آتا کہ آ جاؤ۔ جنرل عزیز کے دفتر میں عموماً جنرل احسان پہلے سے موجود ہوتے۔ جو لوگ آ رہے ہوتے اُن کے بارے میں معلومات بتاتے۔ پھر کچھ لوگ آتے تو ہم اُن سے یوں ہی اِدھر اُدھر کے سوال پوچھتے۔ جب میں نے جاننا چاہا کہ یہ نام کیسے چنے جاتے ہیں تو بتایا گیا کہ ایک لمبی ترتیب ہے۔ جنرل احسان مختلف جگہوں سے نام تلاش کرتے ہیں پھر اُن کے بارے میں معلومات حاصل کرتے ہیں، پھر کچھ کا چناؤ کر کے انٹرویو کے لیے بلوایا جاتا ہے۔ میرے پاس بھی ڈاک میں سینکڑوں لوگوں کی پیشکش آتی کہ میں قوم کی خدمت کے لیے حاضر ہوں۔ میں یہ تمام کاغذات DGMI کو بجھوا دیتا۔ کبھی کسی ایک کی بھی سفارش نہیں کی۔ میں منصفانہ نظام چاہتا تھا، خود ہی اس کو چھیڑ کر کیسے خراب کرتا۔ آج بھی مجھ سے بہت سے لوگ ان جیسی باتوں پر نالاں ہیں۔ کچھ میرے رشتے دار بھی اور بہت سے احباب بھی۔ اللہ سے ڈرتا ہوں کہ وہ مجھ سے ناراض نہ ہو۔ کبھی یوں لگتا جیسے چناؤ انٹرویو سے پہلے ہی ہو چکا ہے۔ صرف شکل دیکھنی ہے یا یوں ہی کارروائی پوری کرنی ہے۔ لیکن یہ صرف میرا اندازہ تھا، وثوق سے نہیں کہہ سکتا۔ مذہبی امور کی وزارت کے لیے جب انٹرویو ہو گیا تو میں نے کہا کہ یہ صاحب تو اس کام کے لیے بالکل مناسب نہیں، کیونکہ اُن کا پرانا ریکارڈ بھی کچھ مشکوک سا تھا اور مجھے یوں بھی اس کام کے لیے پسند نہ آئے۔ لیکن کہا گیا کہ یہی ٹھیک ہیں۔ شاید سرکاری عالم دین ایسے ہی بہتر ہوتے ہوں، جو آسانی سے مڑ سکیں۔ دین کے شرعی احکام کی وہ تشریح کریں جو حکمران کو موافق آئے۔ ہماری معیشت اور مالیاتی اداروں سے متعلق جو لوگ آئے وہ پہلے ہی چنے جا چکے تھے۔ بتایا گیا کہ شوکت عزیز صاحب فنانس (finance) منسٹر ہوں گے، انٹرویو نہیں ہوگا۔ تمام منسٹریاں جن کا ہماری معیشت پر براہِ راست اثر پڑتا ہے اور اُن سے منسلک مالیاتی اداروں وغیرہ کے لیے اپنی ٹیم کا چناؤ بھی شوکت عزیز صاحب خود ہی کریں گے۔ ان میں ٹریڈ (trade)، کامرس (commerce)، انڈسٹری (industry)، پرائیویٹائزیشن (privatisation) وغیرہ کے کیبنٹ ممبران شامل تھے۔ پیٹرولیم منسٹری کے لیے بھی چناؤ پہلے کا تھا۔ لیکن ان سب کو بلایا ضرور گیا کہ دیکھ ہی لیں۔ باقی کارگر جگہوں میں ایک وزیر داخلہ، ایک وزیر اطلاعات اور دفتر خارجہ ہی رہ گئے، جن کا چناؤ بھی اس انٹرویو کے سلسلے سے باہر ہی ہوا۔ البتہ شوکت عزیز صاحب کے علاوہ سب ہی نے چہرہ کرایا۔ شروع میں کیبنٹ کے علاوہ ماہرین کی ایک مشاورتی ٹیم بھی چنی گئی، جس میں خاص کر معیشت سے متعلق ماہرین بھی شامل تھے، تاکہ جنرل مشرف کو فیصلہ کرنے میں مشورہ دے سکیں اور ایک مختلف نکتہ نظر بھی اُن کے سامنے ہو۔ کرپشن کی روک تھام کے لیے NAB (قومی احتساب بیورو) کا ادارہ کیا گیا اور اس کی سربراہی کے لیے فوج سے لیفٹیننٹ جنرل محمد امجد کا چناؤ ہوا، جس پر سب ہی خوش تھے۔ ملک میں پھیلی ہوئی کرپشن ہم سب کے لیے بہت اہم مسئلہ تھی۔ ہر ایک جانتا تھا کہ باقی ہر مسئلے میں اس کی جڑیں پہنچتی ہیں۔ حکومت میں ردوبدل کی تجاویز تیار کرنے کے لیے جنرل ریٹائرڈ تنویر حسین نقوی کو چنا گیا۔ یہ دونوں افسر باصلاحیت اور اعلیٰ کردار کے مالک تھے۔ ان کا فوج میں بہت نام تھا۔ پولیس اور انصاف کے نظام میں بہتری لانے کے لیے بھی فوری کام شروع کر دیا گیا۔ عدلیہ اور پولیس کا نظام ٹھیک کرنا اُن دنوں ہماری اہم ترجیح تھی۔ ساتھ ہی ساتھ سول سروس (civil service) کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے بھی کوششیں شروع ہو گئیں۔ جتنے بھی لوگ مختلف جگہوں پر تعینات ہوئے، سب ہی قابلیت رکھتے تھے۔ ہم سب بھی بہت پُرامید تھے کہ اب ہمارے ملک کا نظام سنبھل جائے گا۔ اس کیبنٹ کی امداد میں مانیٹرنگ (monitoring) کا نظام میں نے تشکیل دیا، پھر ٹی وی پر اس کی تفصیلات بھی بیان کیں۔ میں ہی، DGMO کی حیثیت سے اس نظام کی سربراہی کرتا اور تمام پاکستان سے آئی ہوئی رپورٹوں کو چھانٹ کر متعلقہ وزیروں کو بھیجتا اور ایک کاپی چیف ایگزیکٹیو (Chief Executive) کے دفتر بھی۔ ہمارا بس اتنا ہی کام تھا۔ ہم صرف اُن سے سوال کرنے کے مجاز تھے، کوئی احکامات جاری کرنے کا اختیار نہیں تھا۔ فیصلہ یہ ہوا تھا کہ فوج کسی چیز میں مداخلت نہیں کرے گی، جب تک حکومت اُس سے کسی سلسلے میں امداد نہ مانگے۔ صرف نچلی سطحوں پر حکومت کی کارروائیوں پر نظر رکھے گی، تاکہ چنی ہوئی جنرل مشرف کی ٹیم کو باخبر رکھ سکے کہ ان کے احکامات پر اور حکومت کی پالیسیوں پر کہاں تک عمل ہو رہا ہے۔ اس کے علاوہ کیبنٹ کو کسی مخصوص چیز کے بارے میں پتا کرنا ہوتا تو ہم سے کہہ دیتے، ہم اُس کی رپورٹ بنا کر انہیں بھیج دیتے۔ اگر ان کے سامنے صحیح تصویر ہوگی، تو وہ درست فیصلے کر سکیں گے اور حکومت کی کارکردگی بہتر ہوگی۔ اس طرح عوام اچھی حکومت (good governance) کے اثرات بھی جلد دیکھ پائیں گے۔ اس اصول پر مانیٹرنگ کا نظام قائم ہوا۔ ہر طرف بہت جوش و خروش سے کام شروع ہو گیا۔ پھر آہستہ آہستہ معاملات پرانے ڈگر پر ہی چلنے شروع ہو گئے۔ سول سروس کے جمود نے کچھ بھی آگے نہ بڑھنے دیا۔ ہر چیز میں اُن کے خدشات آڑے آ جاتے۔ انہیں اپنی آزادی پر کسی کی گرفت قبول نہیں تھی اور نہ ہی اپنی کارکردگی پر فوج کی نظر۔ کیبنٹ ان کے بغیر ناکارہ تھی، حکمران بھی۔ سب اُن کے مرہون منت تھے۔ جو ماہرین کی مشاورتی ٹیم چنی گئی تھی اور جن کا دوسرا نکتہ نظر سول سروس سے تصادم پیدا کرتا، جلد ناکارہ بنا دی گئی۔ مانیٹرنگ بھی جنرل مشرف پر بوجھ بن گئی اور وہ اس سے خفا رہتے، کیونکہ اس کے خلاف اُن پر سول سروس کا دباؤ روز بروز بڑھتا جا رہا تھا۔ NAB بھی شوکت عزیز صاحب کے کہنے پر حکومت کے دباؤ میں آنا شروع ہو چکی تھی کہ اس سے معیشت کو خطرہ ہے۔ ہر بات پر قومی مفاد کے جھوٹے نام پر مفاہمت (compromise) ہو رہی تھی، اسے لمبے راستوں پر ڈالا جا رہا تھا تاکہ کسی انجام کو نہ پہنچے۔ جنرل مشرف کو بھی ایسی پیچیدگیوں میں الجھا دیا تھا کہ اُن کے ہاتھ بندھ چکے تھے۔ کوئی سلسلہ بھی آگے بڑھتا نظر نہیں آتا تھا۔ اب گھاگ قسم کی نوکر شاہی جنرل صاحب کی نئی ٹیم تھی، چونکہ اب ملک چلانا تھا۔ نئی ٹیم کو خوش رکھنا تھا، انہیں خوش رکھا۔ قوم سے جھوٹ بولنے کا اور وعدوں کے دلاسوں کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ جب 12 اکتوبر 2000ء آیا، فوجی حکومت کی پہلی سالگرہ، تو میں دفتر میں بیٹھا تھا۔ نہ جانے کیوں اُس دن کوئی کام میرے پاس نہیں آ رہا تھا۔ کافی دیر بیٹھا کھڑکی سے باہر دیکھتا رہا۔ ذہن میں ایسے خیالات پھرتے رہے جن کا میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ سوچا، نہ جانے اللہ کو کیا جواب دوں گا؟ فون اٹھایا اور کہا کہ میری حج کے لیے سیٹ بک کروا دیں۔ اب تک کعبے کا دیدار نہیں کیا تھا۔ (جاری ہے)

☆☆☆☆☆

جمعرات 07 فروری 2013ء

روزنامہ امت کراچی/حیدرآباد

'فوج میں میرٹ کو رواج دیا۔ کئی سفارشی افسروں کی ترقی رکوائی'

تحفہ دینے پر ایک افسر کو ڈانٹ پلادی - اس سختی پر آج بھی لوگ مجھ سے ناراض ہیں - کشمیر میں رہتے ہوئے جارحانہ کارروائیوں کے منصوبے بنائے حج کے دوران کعبے کے سامنے روتا رہا - پھر بھی ہر شام گھنٹوں بیٹھا اپنے اندر غوطے کھاتا رہتا - لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کی کتاب سے اقتباسات

لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کا شمار افواج پاکستان کے مایہ ناز، بلند ہمت، باکردار اور اصول پسند افسران میں ہوتا ہے۔ انہیں جس قدر کامیابیاں حاصل ہوئیں، اس کی وجہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر مکمل یقین ہے۔ جہاں کہیں بھی وطن عزیز کے دفاع اور قومی مفادات کا معاملہ سامنے آیا، وہ حکمرانوں کے سامنے بڑی جرأت اور استقامت سے حاضر سروس جنرل ہوتے ہوئے بھی اختلافی رائے پیش کرتے رہے۔ ڈائریکٹر جنرل تجزیاتی ونگ کی حیثیت سے کارگل کے محاذ کے حوالے سے انہوں نے ہمیشہ حقیقت پسندانہ تجزیہ اعلیٰ فوجی حکام کو مہیا کیا۔ نائن الیون (11/9) کے بعد امریکہ کیلئے فوجی سہولتوں کی فراہمی کے معاملے پر بھی اعلیٰ سطحی فوجی اجلاس میں کھل کر کلمہ حق بلند کیا۔ ان کی ملازمت کا عرصہ فیض کے اس مصرعے کی عملی تفسیر رہا:

جو رکے تو کوہِ گراں تھے ہم، جو چلے تو جاں سے گزر گئے

لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کی اجازت سے، ان کی کتاب "یہ خاموشی کہاں تک" سے منتخب اقتباسات قارئین کی معلومات اور دلچسپی کے لیے پیش کیے جارہے ہیں۔

"جنرل صاحب! آپ نئے معلوم ہوتے ہیں۔" میں سمجھا تو نہیں مگر میں نے ہاں کہا۔ بزرگ تھے، کہنے لگے۔ "میرے پاس بیٹھیں۔" میں بیٹھ گیا۔ 2001ء میں کشمیر کے الیکشن کا انتظام کررہا تھا۔ MO سے تبدیل ہوکر مری میں ڈویژن کمانڈر تعینات ہوا تھا، کشمیر کے علاقے کا ذمہ دار تھا، جہاں سیاسی حکومت بدستور قائم تھی۔ جب اپنے کام سے اگلے مورچوں پر جاتا، تو فارغ ہوکر وہاں کے لوگوں سے بھی مل لیتا کہ الیکشن کے سلسلے میں معلومات رہیں، اور لوگوں سے ملاقات بھی۔ ایک ایسی ہی چائے پر میں نے معمول کے مطابق لوگوں سے بات کی اور کہا کہ اچھے لوگوں کو ووٹ دیں تاکہ اچھی حکومت آئے اور آپ سب کا فائدہ ہو، وغیرہ وغیرہ۔ جب اپنی سناچکا تو ان بزرگ نے مجھے بلایا اور اپنے پاس بٹھالیا۔

کہنے لگے۔ "آپ نے اچھی باتیں کیں، لیکن اگر ہم آپ کے کہنے کے مطابق اچھے لوگوں کو ووٹ دیں تو ہمارے علاقے کا اچھا نمائندہ مظفر آباد میں بیٹھ کر اچھی اچھی باتیں کرے گا اور اپنے تمام ساتھیوں کو ناراض کردے گا، کیونکہ وہ باتیں ان سب پر چوٹ ہوں گی۔ پھر ہمارے سارے کام کیسے ہوں گے؟" میں سنتا رہا۔ کہنے لگے۔ "ہمیں تو ایسا نمائندہ چاہئے جو باقی علاقوں کے ترقیاتی بجٹ موڑ کر ہمارے علاقے میں لگادے، باقی سب کے بچوں کو پیچھے دھکیل کر ہمارے بچوں کو نوکریاں دلوائے، ہمارے تھانہ کچہری کے تمام معاملات نمٹائے۔ اب بھلا بتائیں کہ کیا ایک اچھا آدمی یہ سب کچھ کرسکے گا؟" میں نے سر ہلایا تو کہا۔ "پھر ہم اپنے پاؤں پر کلہاڑی کیوں ماریں؟" میں زمین کو تکتا رہا۔ "اس نظام میں جہاں سارا گند آتا ہو، اچھے آدمی کا کیا کام؟ وہ تو نہ ہی جیت سکتا ہے اور نہ ہی جیت کر کچھ کرسکتا ہے۔ جب نظام اچھا ہوگا پھر ہم اچھے لوگوں کو چنیں گے۔"

ان بزرگ نے دنیا دیکھی تھی، سیاست کی اونچ نیچ سمجھتے تھے۔ ٹھیک کہتے تھے۔ ایک صاحب، جو بہت اچھا نام رکھتے تھے، میں سوچتا تھا اگر جیت گئے تو موزوں وزیراعظم ہوسکتے ہیں۔ مگر الیکشن بالکل شفاف ہوئے، اور ایسے میں شریف آدمی کے جیتنے کی گنجائش کہاں۔ الیکشن سے کسی کو کوئی شکایت نہ تھی۔ ہارنے والوں نے بھی اس بات کی تصدیق کی اور آزاد کشمیر کے تمام اخباروں نے بھی۔ پھر کچھ مسئلہ رہا کہ وزیراعظم کون ہوگا، مگر یہ بھی حل ہوہی گیا، اور سب نے قبول کیا۔

ہماری سپاہ کشمیر کے سرسبز پہاڑوں پر سرحدوں کی حفاظت میں لگی تھی۔ چونکہ ڈویژن کا پھیلاؤ بہت تھا اور زمینی راستوں سے جگہ جگہ پہنچنا ممکن نہ تھا، مجھے ایک چھوٹا ہیلی کاپٹر ملا ہوا تھا۔ ہفتے میں تین روز اپنی سپاہ کے ساتھ گزارتا۔ صبح سویرے نکلتا اور مغرب سے پہلے واپس آتا۔ خوب صورت وادیوں میں اڑتا پھرتا، جہاں دل کرتا اتر جاتا۔ کشمیر کا کونہ کونہ دیکھ لیا۔

مری میں ڈویژن ہیڈکوارٹر رکھنا مجھے پسند نہ آیا تھا۔ سارا ڈویژن کشمیر میں لگا تھا اور ڈویژن ہیڈکوارٹر جہلم دریا کے پیچھے۔ اسپتال بھی یہیں اور بہت سے اور سیٹنے بھی۔ پھر گرمیوں میں سڑکوں پر انتارش ہوتا کہ کسی ایمرجنسی میں آگے کے علاقوں میں پہنچنے میں خاصی دشواری ہوتی، مری کے اردگرد بھی حرکت مشکل ہوتی۔ اس ہی طرح زخمیوں کو پیچھے نکالنے کی بھی دشواریاں تھیں اور اگر جنگ کے دوران جہلم دریا کا پل تباہ کردیا جاتا تو ہیڈکوارٹر اپنی سپاہ سے کٹ کر رہ جاتا۔ مری میں تمام فوجی عمارتیں بھی نہایت بوسیدہ حال میں تھیں، جبکہ جس زمین پر وہ بنی ہوئی تھیں، وہ سونے کے مول تھی۔ میں نے دریا کے پار ایک موزوں جگہ دیکھی اور جنرل مشرف کو تجویز دی کہ اگر ہم مری میں اپنی زمین فروخت کردیں تو ایک بہتر جگہ پر مناسب طرز کا نیا ڈویژن ہیڈکوارٹر تعمیر کیا جاسکتا ہے۔ مگر انہیں میری بات پسند نہ آئی۔

کشمیر میں رہتے ہوئے جنگی مشقیں بھی کروائیں۔ جارحانہ کارروائیوں کے نئے منصوبے بھی بنائے۔ جو پیسے فوج سے دفاعی پوزیشنیں بنانے کے لیے ملتے تھے، یقین کروایا کہ ان کا صحیح استعمال ہو۔ ناجائز چیزوں پر صرف نہ ہوں۔ نئی دفاعی پوزیشنیں بنوائیں۔ اگلے علاقوں میں سپاہیوں کے رہنے کی جگہوں کو اہمیت دی، بہتر کروائیں۔ مری میں گھومنے پھرنے کے لیے سپاہیوں اور ان کی فیملیوں کے لیے کوئی بندوبست نہیں تھا، اس پر کام شروع کروایا کہ ان کو بھی یہ سہولیات میسر ہوں۔ بچوں کو لے کر آئیں تو سستی رہنے کی اور کھانے کی جگہ مل سکے۔ جس پلٹن کی پوسٹوں پر جاتا، دوپہر کا کھانا ان کے ساتھ ہی کھالیتا۔ پہلی مرتبہ جہاں گیا، ایک دعوت تھی۔ قریب قریب کے سب افسران کو بلوایا ہوا تھا، شاندار کھانے چنے تھے۔ میں نے تھوڑا سا کھا کر پلیٹ رکھ دی۔ کھاتا ہی کم ہوں۔ جب واپس آیا تو اسٹاف سے پوچھا کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ کہنے لگے یونٹ کے لیے عزت کی بات ہوتی ہے کہ ڈویژن کمانڈر ان کے ساتھ کھانا کھائے۔ میں نے کہا یہ مناسب طریقہ نہیں، ان کو بتائیں ایسی دعوت نہ کیا کریں۔ اگر کوئی عزت دے تو بدتمیزی بھی اچھی نہیں لگتی، زیادہ کہا نہیں۔ اگلی مرتبہ کہیں اور گیا تو پھر یہی تماشہ ہوا جب واپسی پر اسٹاف سے پوچھا تو پتا چلا کہ تمام بریگیڈیئر کمانڈروں کو بتایا گیا تھا، پھر بھی یہی ہوا۔ پھر بریگیڈیئر کمانڈروں کی کانفرنس میں انہیں سمجھایا کہ یہ فوج کا طریقہ نہیں کہ سرکاری پیسوں پر سینئر افسران کی دعوتیں کی جائیں۔ کہنے لگے کہ اس طرح سے آپ کی ملاقات اردگرد کے دوسرے افسران سے بھی ہوجاتی ہے۔ میں نے پوچھا اس دعوت کے پیسے کون بھرتا ہے، تو کہا کہ یونٹ کے فنڈ سے آتے ہیں۔ میں نے کہا فوری طور پر یہ سلسلہ بند کردیں، لیکن شاید میرا میٹھا انداز انہیں نہ بھایا۔ سلسلہ بند نہ ہوا۔ آخر مجھے ایک تکلیف دہ سرکاری خط لکھنا پڑا کہ کھانے پر ایک ڈش ہوگی اور یونٹ کے علاوہ کوئی باہر کا افسر نہیں آئے گا، تب جا کر میری جان چھوٹی۔ ایک مرتبہ سپاہیوں کی فیملیوں کی بہبودی تنظیم کا کوئی فنکشن تھا جس میں انجم مدعو تھیں۔ جب واپس آنے لگیں تو الوداع کہنے والی بریگیڈیئر صاحب کی بیگم نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے آہستہ سے کہا آپا! آپ کے لیے کچھ تحفے گاڑی کی ڈگی میں رکھوا دیئے ہیں۔ کافی خواتین وہاں کھڑی تھیں، آپا بے چاری شرمندگی سے کچھ بول نہ پائیں اور چپ چاپ گاڑی میں بیٹھ گئیں۔ آکر مجھے بتایا تو میں نے بریگیڈیئر صاحب کو فون کیا اور ڈانٹ پلائی، پھر کہا کہ اس بار تحفے واپس نہیں کررہا تاکہ آپ کو سب کے سامنے شرمندگی نہ ہو، پیسے بھجوا رہا ہوں، اگلی مرتبہ محفل میں واپس کروں گا۔ بازار سے ان کی قیمت پتا کروا کے انہیں خاموشی سے لفافے میں پیسے ڈال کر بھجوا دیئے۔ دوبارہ ایسا نہیں ہوا۔ ڈویژن کے دو وارکورس کوالیفائڈ (War course qualified) بریگیڈیئروں کو میں نے ان کی پیشہ وارانہ کمزوریوں کی وجہ سے سالانہ رپورٹ میں ان فٹ فار پروموشن (unfit for promotion) قرار دیا۔ دونوں جنرل بننے کے قریب تھے اور اثرورسوخ رکھتے تھے۔ سینئر افسران کے بہت فون آئے، مگر میں نے کہا کہ رپورٹیں ایسی ہی رہیں گی۔ بعد میں جب لیفٹیننٹ جنرل ہوا تو ان کے پروموشن بورڈ میں بھی بیٹھا۔ ان کے لیے خوب زور ڈالا گیا مگر میں نے انہیں پروموشن نہ ملنے دی۔ اسی طرح ایک اور افسر کو، جو میرے قریبی جاننے والوں میں سے تھا، میں نے جنرل بننے کے لیے موزوں نہ سمجھا اور اس کی ہوتی ہوئی پروموشن رکوادی۔ ان باتوں پر مجھ سے کافی لوگ ناراض ہوئے کہ تم اپنے جاننے والوں کی بجائے مدد کرنے کے، ان کی "جڑوں میں بیٹھ جاتے ہو۔" میں آئندہ بھی ایسے ہی کرتا رہا اور لوگ ناراض ہوتے رہے۔ آج تک ہیں۔ مجھے مختلف ناموں سے بھی پکارا گیا مگر میں یونہی کرتا رہا کیونکہ فوج میں میرٹ پر سمجھوتہ کرنا، خاص کر اس عہدے پر، ملک اور قوم کے ساتھ عظیم ظلم ہے۔ میں جب تک طاقتور کرسی پر رہا، اللہ کے شکر سے کبھی فوج کے مفاد کو کسی اور ترجیح پر قربان نہیں کیا۔ نہ ہی اپنے اور نہ ہی کسی اور افسر کے لیے کوئی سفارش کی، چاہے اس کے کام کو صحیح ہی جانتا ہوں، نظام میں دخل نہیں دیا۔ اور نہ ہی کبھی کسی کی سنی۔ حالانکہ سفارش کا فوج میں بھی بہت رواج ہوچکا ہے۔ ان باتوں سے نہ صرف فوج کا نقصان ہوتا ہے، بلکہ حق داروں کی حق تلفی بھی۔ ایک مرتبہ جب میں CGS تھا، ایک میجر صاحب میرے پاس آئے، جن کی بیٹی کینسر کی مریضہ، قریب المرگ تھی، مشین پر سانس چل رہی تھی۔ کہنے لگے کہ میری تبدیلی کراچی ہوگئی ہے، کچھ دن کورکوادیں، میری بیٹی اللہ کو پیاری ہوجائے تو میں چلا جاؤں گا، کوئی میری سنتا نہیں۔ ان کی تبدیلی کچھ دن کورکوادی تھی۔ پھر شاید یہ ایک یا دو ماہ بعد گئے۔ اس کے علاوہ مجھے کوئی ایسا واقعہ یاد نہیں۔ الحمدللہ۔ جب میں MO میں تھا، تو یہاں یونٹوں کی نقل و حرکت کا فیصلہ ہوتا ہے اور اس کے لیے باقاعدہ ایک نظام اور ایک دستور بنا ہے۔ ایک باقاعدہ لکھی ہوئی کتاب ہے، تاکہ یونٹوں کو باری باری اچھی چھاؤنی میں اور پاکستان کے مختلف علاقوں میں رہنے کا موقع ملے۔ ایک لیفٹیننٹ جنرل صاحب کی یونٹ کئی مرتبہ "ملاپ" سے، اچھی چھاؤنیوں میں لگاتار رہ چکی تھی، میں نے اسے کسی دور کی چھوٹی چھاؤنی میں بھیجنے کے احکامات جاری کردیئے۔ پہلے تو ان کا فون آیا، میں نے انہیں اصول بتایا، کچھ ناراض ہوئے کہ میں ریٹائر ہونے والا ہوں اور آپ مجھے اصول بتارہے ہیں، میری بات کا لحاظ کریں۔ کافی دباؤ والے انسان تھے اور مجھ سے خاصے سینئر۔ پھر انہوں نے SGS کو فون کیا، میں نے ان سے بھی یہی کہا کہ قانون کے مطابق یہ ہو نہیں سکتا۔ پھر جنرل صاحب نے جنرل مشرف کو خط لکھا کہ میری اتنی سروس کا کچھ لحاظ نہیں کیا جارہا۔ میری ریٹائرمنٹ پر میری یونٹ نے ایک وردی اتارنے کی تقریب رکھی ہے، لیکن اگر فوج میں میری عزت نہیں اور میری آخری خواہش پوری نہیں کی جاسکتی تو میں یونٹ کی اس تقریب میں شرکت نہیں کرسکوں گا۔ یونٹ کے لوگوں کی مجھ سے کچھ توقعات ہیں، میں وہاں کیسے منہ دکھاؤں گا۔ لکھا کہ مجھے امید ہے کہ میری بات کو آپ ضرور اہمیت دیں گے۔ جنرل مشرف نے یہ خط CGS کو عمل کے لیے بھجوا دیا۔ انہوں نے مجھے خط دیا اور کہا کہ مشرف صاحب نے کہا ہے، اس کام کو کریں۔ میں نے خط فائل میں لگایا، اس پر نوٹ لکھا کہ یونٹ پچھلے کتنے برسوں سے کن کن اچھی چھاؤنیوں میں رہی ہے اور اب بھی اگر اسے اچھا اسٹیشن دیا جائے گا تو فوج میں یہ بات ظاہر ہوجائے گی کہ یہاں صرف سینئر افسران کی یونٹوں کا خیال رکھا جاتا ہے، باقی یونٹوں کا کوئی پوچھنے والا نہیں۔ اس سے فوج کے مورال پر بہت برا اثر پڑے گا۔ یہ لکھ کر نیچے لکھا کہ اپنے احکام سے آگاہ کریں۔ اور فائل اوپر بھیج دی۔ خالی دستخط ہوکر واپس آگئی اور یونٹ دیئے ہوئے اسٹیشن پر ہی گئی۔ جنوری 2001ء میں مری ڈویژن کی کمانڈ پر آیا تھا۔ صرف آٹھ ماہ ہی یہاں رہ سکا، لیکن فوج کی تمام سروس میں اتنا لطف کسی اور کام میں نہیں آیا۔ ایک بٹالین کی کمانڈ اور ایک ڈویژن کی، فوج میں دو ہی کمانڈ ہیں جہاں آپ اپنی سپاہ کی براہ راست سربراہی کرتے ہیں اور ان کے اچھے اور برے کے ذمے دار ہوتے ہیں۔ اس کا ایک الگ ہی چسکا ہے، مگر مجھے تھوڑے ہی دن یہ موقع ملا۔ پھر ترقی ہوگئی، تو شکوہ بھی نہ کرپایا۔

مری آکر اس گھر میں رہے جس کو میں بچپن میں سڑک کے کنارے سے دیکھا کرتا تھا۔ سڑک سے صرف اونچی دیوار ہی نظر آتی تھی، لیکن ایک خاکہ سا ذہن میں تھا کہ مری کا جنرل یہاں رہتا ہے۔ شاید گھر کے چھپے ہونے سے اس کا کچھ پراسرار سا تصور میرے ذہن میں بنا تھا۔ آج میں اس میں رہ رہا تھا۔ انگریزوں کے زمانے کا بنا گھر تھا، CMH کا CO رہا کرتا تھا۔ اونچی اونچی چھتیں، ہر طرف روشن دان، گرمیوں میں بھی خاصا ٹھنڈا ہوتا۔ گیٹ پر گارڈ کھڑی تھی اور پہلی مرتبہ پاکستان کا جھنڈا گھر پر لہرا رہا تھا۔ شام کو جب جھنڈا نیچے آتا، گارڈ سلامی دیتی، تو سڑک پر چلنے والے رک جاتے۔ یہ منظر دیکھنے کافی لوگ ہر شام جمع ہوتے۔

گھر کے پچھلی طرف بہت بڑی وادی تھی، شام کو جگمگانے لگتی۔ میں ہر شام سورج ڈھلنے پر یہاں آجاتا، کمبل اوڑھے رات تک بیٹھا رہتا۔ جب حج کر کے آیا تو دل میں ایک سکون سا آگیا۔ پہلی بار لبیک پکارا تھا، یہ دل میں گھس بیٹھا تھا۔ کعبے کے آگے بیٹھ کر سارا رونا رو آیا۔ خود کو دھو آیا۔ پھر بھی ہر شام جب اس وادی میں ٹمٹماتی بتیاں ستاروں سے مل جاتیں تو گھنٹوں بیٹھا اپنے اندر غوطے کھاتا رہتا۔ (جاری ہے)

☆☆☆☆☆

’امریکہ کو جیکب آباد ایئربیس دینے کی مخالفت کی تھی‘

ایم او کی میٹنگ میں کوئی افسر بھی فضائی اڈا دینے کے حق میں نہ تھا لیکن مشرف بولے میں امریکہ کو ہاں کر چکا ہوں-اس سے قبل افغانستان پر حملے کیلئے امریکی طیاروں کو بلوچستان کے اوپر سے گزرنے کی اجازت دی جا چکی تھی-امریکی احکامات کی تابعداری میں رکاوٹ بننے والوں کو سائیڈ لائن کر دیا جاتا-لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کی کتاب سے اقتباسات

لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کا شمار افواج پاکستان کے مایہ ناز، بلند ہمت، باکردار اور اصول پسند افسران میں ہوتا ہے۔انہیں جس قدر کامیابیاں حاصل ہوئیں، اس کی وجہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر مکمل یقین ہے۔ جہاں کہیں بھی وطن عزیز کے دفاع اور قومی مفادات کا معاملہ سامنے آیا، وہ حکمرانوں کے سامنے بڑی جرأت اور استقامت سے حاضر سروس جنرل ہوتے ہوئے بھی اختلافی رائے پیش کرتے رہے۔ ڈائریکٹر جنرل تجزیاتی ونگ کی حیثیت سے کارگل کے محاذ کے حوالے سے انہوں نے ہمیشہ حقیقت پسندانہ تجزیہ اعلیٰ فوجی حکام کو مہیا کیا۔ نائن الیون (11/9) کے بعد امریکہ کیلئے فوجی سہولتوں کی فراہمی کے معاملے پر بھی اعلیٰ سطحی فوجی اجلاس میں کھل کر کلمہ حق بلند کیا۔ ان کی ملازمت کا عرصہ فیض کے اس مصرعے کی عملی تفسیر رہا:

جو رکے تو کوہِ گراں تھے ہم، جو چلے تو جاں سے گزر گئے

لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کی اجازت سے، ان کی کتاب ”یہ خاموشی کہاں تک“ سے منتخب اقتباسات قارئین کی معلومات اور دلچسپی کے لیے پیش کیے جا رہے ہیں۔

ایک شام میری بیٹی سارہ نے کہا ”جلدی ٹی وی دیکھیں، یہ کیا ہو رہا ہے“۔ نیویارک کے ورلڈ ٹریڈ سینٹر کی ایک بلند و بالا عمارت سے ہوائی جہاز ٹکرا چکا تھا، دھواں نکل رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک اور جہاز نمودار ہوا اور دوسری عمارت میں جا گھسا۔ سڑکوں پر ہنگامہ تھا۔ کچھ دیر میں دونوں ہی عمارتیں زمین بوس ہو گئیں۔ اس وقت ہم سمجھے نہیں کہ مسلمانوں پر بھی سورج غروب ہو رہا ہے۔ ایک مہینے بعد اکتوبر کی 12 تاریخ کو، میں ترقی پا کر واپس GHQ میں CGS تعینات ہو گیا۔ واپس ملک کے مسائل میں جھوٹ کے بازار میں الجھنے۔

11 ستمبر 2001ء کو ورلڈ ٹریڈ سینٹر کے ٹاورز گرنے کے بعد یونی پولر ورلڈ (unipolar world) کی حقیقتیں کھل کر دنیا کے سامنے آ گئیں۔ یہ واقعہ انتہائی مشکوک حالات میں رونما ہوا۔ امریکہ کے بہت سے ماہرین کا دعویٰ ہے کہ یہ کام امریکہ کی خفیہ ایجنسیوں اور یہودی تخریب کاروں کے گٹھ جوڑ سے رونما ہوا۔ وہ اس کے شواہد پیش کرتے ہیں۔ کسی بھی مجرمانہ کارروائی میں سب سے پہلے یہ چیز دیکھی جاتی ہے کہ اس کارروائی سے مستفید کون ہوا، اور 11/9 کے واقعے سے یقیناً یہودیوں کے عزائم کو، جن کا بیڑا امریکہ کی حکومت اور ان کے ساتھیوں نے اٹھایا ہوا ہے، تقویت ملی۔

یہ جیسے بھی ہوا، امریکہ کیلئے مسلم دنیا پر چھا جانے کا ٹرگر (trigger) بنا۔ دوسرے ہی دن جنرل کولن پاول (US Secretary of State, General Colin Poweell) نے جنرل مشرف کو فون کر کے کہا ”کیا آپ ہمارے ساتھ ہیں یا ہمارے خلاف؟“ جنرل مشرف کی کتاب سے پتا چلا کہ انہوں نے جواب دیا کہ ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ اس ساتھ دینے کی کیا حدیں تھیں، نہیں لکھا۔ جس طرح بعد میں امریکہ کے احکامات کی ہم نے تابعداری کی، پتا لگا کہ ان حدوں کا تعین نہیں کیا گیا۔ کوئی معاہدہ نہیں تھا، جس سے حدوں کا تعین ہو سکتا۔ جنرل مشرف بھی آہستہ آہستہ بات کو کھولتے رہے، جیسے لوگوں کو چھوٹے چھوٹے گناہ کرواتے ہوئے بڑے گناہ کی طرف مائل کیا جائے۔ پھر جہاں رکاوٹ نظر آتی اسے یا تو دبا کر چپ کرا دیا جاتا، یا ہٹا دیا جاتا، یا پھر اطلاعات اور احکامات کے دائرے سے باہر رکھا جاتا۔ اس کی صفائی بعد میں انہوں نے یوں پیش کی کہ کہہ دیا کہ سب کو بتانا لازم نہیں ہوتا، ضرورت کے مطابق (need to know basis) بتایا جاتا تھا۔ ایک زبانی سا امدادی نظام چلتا رہا، جس کی حدیں آہستہ آہستہ بڑھائی جاتیں اور ہمارے دشمن اپنے مقاصد حاصل کرتے رہتے۔ ہم ہاں کرتے رہے اور اس دلدل میں ڈوبتے رہے۔ حکومت محفوظ رہی اور پیسے آتے رہے۔

جب کور کمانڈر کانفرنس میں یہ مسئلہ اٹھا، میں مری میں تھا، ایک ماہ بعد GHQ آیا۔ تب تک اس موضوع پر تمام جھگڑے نمٹائے جا چکے تھے۔ مجھے آنے پر پتا چلا کہ کور کمانڈروں کی کانفرنس میں کچھ کور کمانڈروں نے امریکہ کا ساتھ دینے کی مخالفت کی، کچھ نے جنرل مشرف کا ساتھ دیا اور زیادہ تر خاموش رہے۔ جنرل مشرف، مخالفت کرنے والوں پر ناراض ہوئے، پھر اپنا نکتہ نظر بیان کر کے بات ختم کر دی۔ خاموش رہنے والے ’ہاں‘ میں شامل ہوئے۔ میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ کیا باتیں ہوئیں، مگر لب لباب یہ تھا کہ پاکستان کے مفاد میں نہیں کہ ہم امریکہ کے خلاف کھڑے ہوں، اور نہ ہی ہماری صلاحیت اتنی ہے۔ ہم نے اپنی معیشت کو تباہی سے بچانا ہوگا، یہ تمام باتوں سے اہم ہے۔ ہندوستان امریکہ کو اپنی سرزمین استعمال کرنے کا عندیہ دے چکا ہے، اور کہا ہے کہ آخر آپ کو پاکستان سے بھی تو نمٹنا ہے، ہندوستان سے کارروائیاں شروع کریں اور افغانستان اور پاکستان دونوں مسئلوں کو ایک بار ہی لپیٹ لیں۔ کہا گیا کہ ہم اس لڑائی سے باہر رہیں گے۔ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں، اگر غلط فیصلہ کرتے تو ہماری ایٹمی صلاحیت بھی خطرے میں پڑ سکتی تھی۔ یعنی بھوک کا جھوٹا خوف دلا کر، اپنی طاقت کو اپنی کمزوری ظاہر کیا۔

ملک میں بھی سوائے چند بجھے بجھے سے اختلافات کے، سب نے ہی ان کا ساتھ دیا۔ اسلامی تنظیموں کے علاوہ کوئی اور آواز نہ اٹھی، وہ بھی بس اس حد تک کہ لوگوں کی نظروں میں سرخرو ہو جائیں۔ ساری حکومتی مشین اس ہی پالیسی پر چل پڑی۔ زیادہ تر لوگوں کا یہی خیال تھا کہ مشرف صاحب کا فیصلہ درست تھا۔ آج بھی یہی سوچ نمایاں ہے۔

CGS کی کرسی پر لیفٹیننٹ جنرل عزیز کے بعد لیفٹیننٹ جنرل یوسف آ گئے تھے۔ جب میں CGS آیا تو وہ جنرل بن کر وائس چیف کے عہدے پر فائز تھے۔ جنرل یوسف فوج میں سخت خو کمانڈر کے طور پر جانے جاتے تھے، مگر ایک سخت خول کے اندر ایک نہایت نرم دل انسان تھا، اللہ سے خوف کھانے والا۔ جب نیا CGS تعینات کرنا تھا، تو چونکہ جنرل مشرف خود آرٹلری سے تھے اور نئے وائس چیف آرمڈ کور سے تھے، اس لیے انہیں مشورہ دیا گیا کہ کسی انفنٹری کے افسر کو لگانا مناسب ہوگا، ورنہ ان کے ذہن میں CGS کیلئے کسی اور کا نام تھا۔ اس وجہ سے مجھے، جنرل یوسف کے کہنے پر، آٹھ ماہ کی ڈویژن کی کمانڈ کے بعد ہی پروموشن دے کر یہاں لایا گیا۔ دو سال بعد جب میں یہاں سے فارغ ہو کر جا رہا تھا تو الوداعی چائے پر، جہاں GHQ کے اور بہت سے جنرل افسر آئے ہوئے تھے، جنرل یوسف نے میرے بارے میں کہا ”ان کی وجہ سے میرا کام نہایت آسان رہا، کیونکہ یہ تمام چیزوں پر خود ہی فیصلہ دے دیا کرتے تھے“۔ نہ جانے وہ ناراض تھے یا تعریف کی تھی۔

مجھے جنرل مشرف کے احکامات وائس چیف ہی کے ذریعے ملتے۔ میرے دو سال یہاں رہنے میں، ایک مرتبہ بھی CGS کے طور پر میری اپنے چیف سے اکیلے میں ملاقات نہیں ہوئی۔ جب ملاقات ہوتی کسی میٹنگ میں ہوتی، جہاں کافی لوگ ہوتے۔ یا پھر کسی نجی محفل میں جہاں سرکاری بات نہ ہو سکتی۔ فوج کے دستور کے مطابق ایک اسٹاف افسر اپنے کمانڈر کی مخالفت، اس کے ماتحت کمانڈروں کی موجودگی میں نہیں کرتا۔ اگر کوئی اختلاف ہو تو علیحدگی میں اسے آگاہ کرتا ہے۔ شاید اس ہی وجہ سے مجھے مشرف صاحب سے یوں ملنے کا شرف حاصل نہ ہو سکا۔

جنرل مشرف نے حکومت میں آنے کے کچھ عرصہ بعد ہی فرقہ وارانہ تنظیموں پر سختی شروع کر دی تھی۔ یہ خوفناک گروہ ایران عراق کی جنگ کے دنوں سے پاکستان میں زور پکڑ چکے تھے۔ سعودی اور ایرانی پیسوں پر پلنے والی یہ تنظیمیں ملک میں نفرتوں کے بیج بوتیں اور فرقہ وارانہ فساد پیدا کرتیں۔ فساد پھیلانے کی خاطر عوام پر حملے بھی کرتے۔ ایک زمانے میں ایران کے ثقافتی مراکز بند کرنے کی تجویز بھی دی گئی تھی، لیکن پیچیدگیوں کے باعث اس منصوبے پر عمل نہ ہو سکا۔ سعودی عرب سے چونکہ تیل کی صورت میں مالی امداد ملتی تھی، اس لیے ان کا زور زیادہ تھا۔ پچھلی حکومتوں نے، کچھ ان کے خوف سے اور کچھ ان کی پشت پر کھڑی طاقتوں کے دبدبے سے، دونوں اطراف کی تنظیموں پر ہلکا ہاتھ رکھا رہا۔ ان تنظیموں نے ملک میں بہت خرابی پھیلائی۔

پھر جنرل ضیا کے دور میں افغانستان اور کشمیر کی جہادی تنظیمیں وجود میں لائی جا چکی تھیں۔ یہ سب ہی اپنی طاقت مسجدوں اور مدرسوں سے حاصل کرتے، کیونکہ یہ اس وقت کی حکومت کی پالیسی تھی۔ عوام میں بھی جہادیوں کی خاصی قدر تھی۔ ان کا کام ہی ایسا تھا۔ افغانستان اور کشمیر کی بالکل علیحدہ مجاہد تنظیمیں تھیں۔ گو کچھ رابطے ضرور رہتے، لیکن کوئی براہ راست تعلق نہیں تھا۔ فرقہ وارانہ تنظیمیں اور مجاہدین، دو علیحدہ سلسلے تھے۔ ایک ہمارے ہیرو تھے اور دوسرے ناسور، مگر دونوں ہی مذہب کے زور پر چلتے۔

پھر جب 11/9 کا یوٹرن لیا تو اچانک کل کے ہیرو آج کے دشمن بن گئے۔ غدار کہلائے۔ کشمیر کے مجاہدین تو کچھ نہ کچھ سنبھل ہی گئے، کیونکہ ان کا سلسلہ آہستہ آہستہ ختم کیا گیا۔ افغانستان میں ایک آزاد حکومت قائم تھی، جسے ہم نے تسلیم بھی کیا ہوا تھا۔ روس کے خلاف شروع کئے ہوئے جہاد میں افغانیوں اور القاعدہ کے علاوہ اور کئی ممالک کے باشندے بھی شامل تھے، جن سب کو ہمارا اور امریکہ کا تعاون حاصل تھا۔ پھر جب افغانستان سے سوویت یونین چلا گیا تو کئی غیر ملکی مجاہدین پاکستان ہی میں رہ گئے۔ یہیں شادیاں کیں اور اپنے بچوں کے ساتھ رہتے رہے۔ اس کے علاوہ، لاکھوں افغان مہاجرین بھی یہاں رہتے تھے۔ ایک کھچڑی سی تھی، جو امریکہ کا حملہ شروع ہوتے ہی پھر سے ابلنے لگی۔

میرے یہاں آنے کے کچھ بعد MO میں ایک میٹنگ ہوئی، جس میں جنرل مشرف بھی آئے۔ MO میں ایسی ملاقاتوں پر وائس چیف، میں، DGMO، DGMI چیف کے اسٹاف افسر اور کچھ MO کا اسٹاف ہوتا۔ کبھی کبھار، ضرورت پر، اوروں کو بلوا لیتے۔ جنرل مشرف نے صاف الفاظ میں کہا کہ ہم اس لڑائی میں غیر جانبدار رہیں گے۔ کہنے لگے کہ جب پاکستان اور ہندوستان کی لڑائی ہوتی ہے تو کوئی بھی ہمارا ساتھ دینے کھڑا نہیں ہوتا۔ اگر آج امریکہ افغانستان پر حملہ کر رہا ہے تو ہم اکیلے اس کا ساتھ کیسے دیں؟ اگر اور بھی مسلم ممالک اس کا ساتھ دینے پر آمادہ ہوں، تو پھر ہم بھی مل کر ساتھ دے سکتے ہیں۔ کہا کہ ہم اس جنگ سے باہر رہیں گے، اس کا حصہ نہیں بنیں گے۔ ہم سب نے اس بات پر رضامندی کا اظہار کیا۔

امریکی ہوائی جہازوں کو، افغانستان پر حملے کیلئے، بلوچستان کے اوپر سے گزرنے کی اجازت دی جا چکی تھی۔ کچھ دنوں بعد MO میں ایک اور میٹنگ ہوئی، جس میں جنرل مشرف نے کہا کہ امریکہ جیکب آباد کا ہوائی اڈہ استعمال کرنا چاہتا ہے، تاکہ اگر کسی ہوائی جہاز میں، کارروائی کے دوران، فنی خرابی ہو جائے تو ایمرجنسی لینڈنگ کر سکے۔ میں نے کہا کہ یہ تو ہماری غیر جانبدارانہ پالیسی کے خلاف ہے۔ تو کہنے لگے نہیں میں تو انسانیت کی بنیادوں (humanitarian grounds) پر دینا چاہتا ہوں، صرف پائلٹ کی جان بچانے کیلئے۔ جب کوئی بھی ان کی طرف داری میں نہ بولا تو ناراض ہو گئے اور غصے سے کہا کہ میں ان کو ہاں کہہ چکا ہوں۔ ہم ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہے۔

کچھ دنوں میں ان کے دفتر سے حکم ملا کہ جیکب آباد ہوائی اڈے کی حفاظت کیلئے کچھ سپاہ تعینات کر دیں۔ کوئٹہ کی کور کو احکامات جاری کر دیئے کہ ایک بٹالین بھیج دیں۔ بٹالین جب وہاں پہنچی تو وہاں پہلے سے امریکی فوج کے لوگ موجود تھے، جنہوں نے ہماری سپاہ کو ایئرپورٹ کے باہر ہی روک دیا اور کہا کہ اس جگہ کی حفاظت ہم خود کر رہے ہیں، آپ لوگ یہاں نہیں آ سکتے۔ آپ نے جو دفاع لگانی ہے وہ ہمارے حفاظتی حصار کے باہر رہتے ہوئے لگائیں۔ پھر ان کی سپاہ کے باہر رہتے ہوئے ہماری سپاہ نے حفاظتی پوزیشنیں اختیار کیں۔ کچھ عرصے بعد اس ہی بٹالین سے پتا چلا کہ یہ اڈہ لگاتار جنگی ہوائی جہازوں کیلئے استعمال ہو رہا ہے، جن کی پروازیں رات دن جاری رہتی ہیں۔ یقیناً اس ہی مقصد سے اڈا دیا گیا تھا، پائلٹ کی جان بچانے کو نہیں۔ جب جنرل مشرف کو یہ بات بتائی گئی تو انہوں نے کہا کہ امریکنوں نے لیا تو اس ہی غرض سے تھا، اب پتا نہیں وہ یہاں کیا کر رہے ہیں۔ بات کو یوں ٹال کر آگے بڑھ گئے، جیسے کوئی غیر اہم سی بات ہو۔

ہم آہستہ آہستہ اس جنگ میں پوری طرح سے امریکہ کے اتحادی بن گئے۔ افغانستان میں مسلمانوں کے قتل عام میں اسی طرح ملوث ہو گئے جیسے امریکہ کے باقی اتحادی۔ صرف ایک جھوٹ کا پردہ آنکھوں پر ڈال دیا گیا، جسے رفتہ رفتہ یہ رنگ دینا شروع کیا کہ یہ جنگ ہماری اپنی بقا کی جنگ ہے۔

☆☆☆☆☆

ہفتہ 09 فروری 2013ء

روزنامہ امت کراچی/حیدر آباد

”جنرل یوسف امریکی جنگ میں شمولیت کے خلاف تھے“

وائس چیف آف آرمی اسٹاف مشرف کی امریکہ نواز پالیسیوں سے پریشان رہے- گوادر پورٹ سے امریکی جنگی سازوسامان کی افغانستان تک ترسیل سے لاعلم رکھا گیا- اس وقت میں سی جی ایس تھا- کراچی سے نیٹو رسد لے جانے کا علم بھی اخبار سے ہوا- امریکہ کیساتھ گٹھ جوڑ پر اعتراضات کے سبب بے خبر رکھا جاتا تھا- لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کی کتاب سے اقتباسات

لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کا شمار افواج پاکستان کے مایہ ناز، بلند ہمت، باکردار اور اصول پسند افسران میں ہوتا ہے۔ انہیں جس قدر کامیابیاں حاصل ہوئیں، اس کی وجہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر مکمل یقین ہے۔ جہاں کہیں بھی وطن عزیز کے دفاع اور قومی مفادات کا معاملہ سامنے آیا، وہ حکمرانوں کے سامنے بڑی جرأت اور استقامت سے حاضر سروس جنرل ہوتے ہوئے بھی اختلافی رائے پیش کرتے رہے۔ ڈائریکٹر جنرل تجزیاتی ونگ کی حیثیت سے کارگل کے محاذ کے حوالے سے انہوں نے ہمیشہ حقیقت پسندانہ تجزیہ اعلیٰ فوجی حکام کو مہیا کیا۔ نائن الیون (11/9) کے بعد امریکہ کیلئے فوجی سہولتوں کی فراہمی کے معاملے پر بھی اعلیٰ سطحی فوجی اجلاس میں کھل کر کلمہ حق بلند کیا۔ ان کی ملازمت کا عرصہ فیض کے اس مصرعے کی عملی تفسیر رہا:

جو رکے تو کوہِ گراں تھے ہم، جو چلے تو جاں سے گزر گئے

لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کی اجازت سے، ان کی کتاب ”یہ خاموشی کہاں تک“ سے منتخب اقتباسات قارئین کی معلومات اور دلچسپی کے لیے پیش کیے جا رہے ہیں۔

میں گوادر کے ساحل پر بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ شام کے ڈھلتے سورج کی کرنیں پانی کے سکوت پر چمک رہی تھیں۔ ایک ریٹائرڈ میجر صاحب، جو گوادر پورٹ پر کام کرتے تھے، مجھے ملنے آئے، پاس بٹھا لیا۔ مجھے بھی فوج سے ریٹائر ہوئے سال بھر ہو چکا تھا۔ NAB میں کام کر رہا تھا اور اسی سلسلے میں یہاں آیا تھا۔ باتوں باتوں میں میجر صاحب نے کہا ” سر! یہاں امریکنوں کی نیوی نے ساحل پر اترنے (amphibious landing) کی خاصی بڑی کارروائی کی تھی اور پانی کے جہازوں سے کافی جنگی سازوسامان اتارا تھا، پھر ان کی گاڑیاں، جو ان جہازوں پر ہی آئی تھیں، یہ سامان لے کر افغانستان کی جانب چلی گئیں“۔ میں نے پوچھا ” یہ کب کی بات ہے؟ “ تو جو وقت میجر صاحب نے بتایا، میں ان دنوں CGS تھا۔ مجھے یقین نہ آیا۔ میں نے کہا ”اگر ایسا ہوا ہوتا تو مجھے ضرور علم ہوتا“۔ کہنے لگے ” اگر میری بات کا یقین نہیں تو میرے ساتھ صبح چلیں، آج بھی وہاں ان کے نشانات موجود ہیں“۔ میں ان کے اصرار پر صبح ان کے ساتھ اس جگہ پہنچ گیا۔ یقیناً ساحل پر تمام نشانات موجود تھے، بکتر بند گاڑیوں کے بھی۔ دفاعی مورچے بھی کھدے تھے۔ میں دیکھ کر بہت حیران ہوا اور سوچا کہ کیا وجہ تھی کہ فوج کے CGS سے یہ بات چھپائی گئی۔ کتنے ہی لوگوں کو تو خبر ہوگی، آخر مجھے کیوں نہ پتا چلا۔ یقیناً ISI اور MI دونوں کو اس کا علم ہوگا۔ MI کا ادارہ تو میرے نیچے ہی کام کرتا تھا، مگر ان دنوں کچھ نوعیت ایسی تھی کہ جو اجازت ہوتی وہی مجھ کو بتایا جاتا۔ پھر کوسٹ گارڈ (Coast Guard) جو فوجی کارروائیوں میں کراچی کے کور کے نیچے کام کرتی ہے، انہیں بھی یقیناً علم ہوگا اور کراچی کے کور کمانڈر کو بھی، فضائیہ اور نیوی کو بھی۔ لیکن CGS کو اس کی بھنک نہ لگنے دی گئی۔

واپس آیا تو پرانی نوٹ بک کھولی، صفحے پلٹے تو دیکھا، لکھا تھا” امریکی فوج ارمارہ یا جیوانی کے ساحل سے افغانستان کو ایک زمینی راستہ کھولنے کا سوچ رہی ہے“۔ کچھ آگے لکھا تھا 19” نومبر 2001ئ، صدر صاحب کے دفتر سے بتایا گیا کہ پسنی اور ارمارہ کا علاقہ دیکھنے کیلئے امریکنوں کو اجازت دے دی گئی ہے“۔ پھر اس علاقے میں دو یا تین امریکن میرینز (marines) بھی آئے جو نومبر کے آخر تک علاقہ دیکھ کر واپس چلے گئے۔ اس کا بھی اندراج ڈائری میں تھا۔ اس کے علاوہ اور کوئی اطلاع میرے پاس نہیں تھی۔ جنرل یوسف صاحب سے ملنے گیا، جو ان دنوں وائس چیف ہوا کرتے تھے، اب ریٹائر ہو چکے تھے۔ وہ بھی لاعلم تھے اور سن کر بہت حیران ہوئے۔ مجھ سے کیوں چھپایا گیا، کہہ نہیں سکتا۔ یہ بھی شاید ”need to know basis" پر ہوا تھا۔ CGS فوج میں وہ منصب ہے، جسے فوج کی تمام کارروائیوں کی خبر ہونی لازم ہے، خاص کر اس نوعیت کی کارروائیاں۔ مگر ان دنوں، کیونکہ فوج میں امریکہ کے ساتھ اس گٹھ جوڑ پر بہت اعتراضات تھے، اس وجہ سے "need to know basis" پر کام کیا جا رہا تھا۔ ایک اور ایسا ہی قصہ یوں کھلا کہ میرے دفتر میں MI سے روزانہ اخباروں کی تمام اہم خبروں کے کلپ کردہ تراشوں کی فائل بھیجی جاتی تھی۔ ایک دن ایک خبر آئی کہ کراچی کے پرانے ایئر پورٹ کے نزدیک کوئی جھگڑا ہو گیا، جس میں کچھ فوجی بھی شامل تھے۔ میں نے اس خبر پر سوالیہ نشان لگا دیا۔ اگلے دن اس کا جواب لکھا ہوا آیا تو پتا چلا کہ یہ سپاہی جن کا جھگڑا ہوا تھا NLC (National Logistic Cell) کے ڈرائیور تھے، جو یہاں پر قائم ایک امریکی دفتر کے ساتھ کام کر رہے تھے۔ یہ دفتر کراچی پورٹ سے NLC کی گاڑیوں پر سامان لاد کر افغانستان پہنچانے کیلئے قائم کیا گیا تھا۔ یہ کام فوج کی نگرانی میں ہو رہا تھا۔ میں نے QMG (Quarter Master General) کو فون کیا، جو GHQ میں بیٹھتے ہیں اور NLC ان ہی کے نیچے کام کرتی ہے، تو انہوں نے اس بات کی تصدیق کی۔ اگر یہ خبر میں اخبار میں نہ پڑھتا اور اس پر سوالیہ نشان نہ لگاتا تو شاید یہ بات بھی میرے علم میں نہ آتی۔ ہماری فوج، امریکی فوج کی رسد لیے کراچی سے افغانستان تک پھیلی ہوئی تھی اور CGS بے خبر تھا۔ جنرل مشرف سے جب بھی کوئی ایسی بات کہی جاتی، وہ گول مول کر کے ٹال دیتے۔ کہتے میں سب سمجھ رہا ہوں، جو پاکستان کے لیے بہتر ہے وہی کر رہا ہوں۔ آپ لوگ نہیں جانتے امریکہ کی حکومت کا کتنا دباؤ ہے اور ہم کس مشکل میں پھنسے ہوئے ہیں۔ میں تمام تصویر دیکھتا ہوں (I see the bigger picture) آپ کی نظر سارے معاملات پر نہیں ہوتی۔ سب کچھ ملک کیلئے ہی کر رہا ہوں۔ حالات کی پیچیدگیوں کو سمجھیں اور صرف جذباتی انداز میں چیزوں کو نہ دیکھیں۔ آج حقیقت پسندی کی ضرورت ہے۔ ہمارا ملک کبھی ایسے حالات سے دوچار نہیں ہوا۔ حوصلے اور تحمل سے کام لینا ہوگا۔ پھر میں چپ ہو جاتا۔ کبھی لگتا کہ شاید میں ہی جذبات میں بہک رہا ہوں، باقی سب تو ان ہی کے خیالات رکھتے ہیں۔ سارا ملک ہی۔ مگر اپنے آپ کو لاکھ سمجھانے پر بھی دل کو چین نہ آتا۔ نومبر 2001ء کے شروع میں MO سے پتا چلا کہ امریکی فوج کی ٹاسک فورس سورڈ (TF SWORD) کی کارروائیاں شمالی اتحاد کے ساتھ مل کر شروع ہیں اور وہ شمالی افغانستان سے کابل کی طرف پیش قدمی کریں گی۔ اس کارروائی کیلئے چیف ایگزیکٹو (Chief Executive-CE) کے دفتر سے امریکنوں کو شمسی، ژوب اور دالبندین کی ایئر اسٹرپس (airstrips) کچھ عرصے کیلئے استعمال کرنے کی اجازت دے دی گئی ہے۔ امریکی CENTCOM کے نمائندے MO میں ارتباط کیلئے بھی آئے۔ یہ اور CIA کے نمائندے گاہے بگاہے MO میں آتے رہتے۔ مجھ سے بھی کبھی کبھار ملنے آتے۔ MO سے بتایا گیا کہ شمسی پران کا بیس ہوگا، جہاں جیٹ ایئر فیلڈ موجود تھی جو متحدہ عرب امارات کے کسی شہزادے نے شکار میں سہولت کیلئے بنوائی تھی۔ اگر ضرورت پڑی تو دالبندین اور ژوب کی ایئر اسٹرپس استعمال کی جائیں گی۔ ہمارے اندرونی خدشات اور لوگوں کی ناراضگی کو ذہن میں رکھتے ہوئے یہ فیصلہ ہوا کہ اگر دالبندین اور ژوب ایمرجنسی میں استعمال بھی ہوئے تو صرف رات کو ہی ہوں گے۔ شمسی پر، صرف اس آپریشن کیلئے چار C-130 جہاز اور بارہ ہیلی کاپٹر ہوں گے، جو طالبان کے سپلائی کے راستوں کو کاٹنے (interdict) میں استعمال ہوں گے۔ اسی مہینے یہ بھی پتا چلا کہ CIA کے ڈرونز (drones) شمسی پہنچ چکے ہیں اور یہیں رہیں گے۔ کہا گیا کہ یہ ویسے بھی ہمارا ہوائی اڈا نہیں ہے۔ یہ علاقہ ہم نے متحدہ عرب امارات کو طویل مدت کی لیز پر دیا ہوا ہے اور انہوں نے ہی یہ اڈا تعمیر کروایا ہے۔ ہمارا اس پر کوئی اختیار نہیں۔ ویسے بھی چونکہ یہ آبادی سے دور ہے لوگوں کی نظروں میں نہیں آئے گا۔ MO سے ملی ہوئی یہ خبریں میں نے جنرل یوسف کو بتائیں اور کہا کہ ہمارے لیے یہ باتیں بہت پیچیدگیاں پیدا کر دیں گی۔ ہمیں اس طرح امریکہ کی جنگ میں ملوث نہیں ہونا چاہیے۔ انہوں نے امریکہ کے بڑھتے ہوئے دباؤ اور ہماری مجبوریوں کا ذکر کیا اور کہا کہ جنرل مشرف بھی ان تمام چیزوں کی پیچیدگیوں سے واقف ہیں اور جو کم سے کم کر سکتے ہیں وہی کر رہے ہیں، حالات کو ہم سے بہتر سمجھتے ہیں۔ جنرل یوسف خود بھی ان باتوں سے پریشان رہتے تھے اور امریکہ کے حق میں اس جنگ میں ہماری شمولیت کے حامی نہ تھے، مگر ہماری کمزوریوں کا بھی لحاظ تھا۔ امریکی فوج کے کابل پر قبضہ کرتے ہی ہندوستان کے بہت سے لوگ وہاں پہنچ گئے۔ یہ اپنے ساتھ ٹی وی، وی سی آر، اداکاروں کے نیم عریاں پوسٹرز اور اسی قسم کے اور مواد لے کر آئے اور فوراً ہی کابل ٹی وی اسٹیشن کی نشریات بھی شروع کر دیں۔ تمام سامان لوگوں میں اونے پونے داموں بانٹ دیا۔ یہ ان کا افغانستان میں پہلا قدم تھا۔ پھر آہستہ آہستہ حکومت کے ہر محکمے میں داخل ہوتے گئے، کہیں مشیر، کہیں تربیت دینے، کہیں محکموں کی تعمیر نو کی خاطر اور کہیں بہبود نسواں کیلئے۔ اہم محکمے جو انہوں نے چنے وہ تھے: انصاف اور پولیس کا نظام، فوج کی تشکیل اور تربیت، دفتر خارجہ، تعلیمی نظام اور خفیہ ایجنسی۔ ان کی تمام تفصیلات ISI کے ذریعے ہمیں ملتی رہیں۔ (جاری ہے)

☆☆☆☆☆

قسط نمبر 9

"افغان طالبان کو پاکستان میں داخل کرنے کے ذمہ دار امریکی تھے"

انہیں تورا بورا سے دھکیل کر ہمارے ملک تک لایا گیا - ہمیں خبر ہونے تک بہت دیر ہو چکی تھی - جنرل ٹومی فرینک سے شکایت کی تو انہوں نے کہا جنگ میں ایسی غلطیاں ہوتی رہتی ہیں - مشرف نے کہا ہمارے ملک سے امریکیوں پر حملے نہیں ہونے چاہئیں - لیفٹیننٹ جنرل شاہد عزیز کی کتاب سے اقتباس

دسمبر 2001ء کے شروع میں فوج نے قبائلی علاقے میں پہلا قدم رکھا، وہاں کے لوگوں کے لئے ترقیاتی منصوبے شروع کرنے کے لیے۔ اسی دوران ہمیں یہ خبر دی گئی کہ افغانستان سے کچھ عرب جنگجو پاکستان میں داخل ہو سکتے ہیں، جس کا زیادہ خدشہ بلوچستان کے علاقے سے ہے۔ بارڈر پر بارہ جگہیں چمن کے اردگرد اور آٹھ پاراچنار کے علاقے میں ایسی تھیں جن پر فرنٹیئر کور (FC) کے دستے تعینات کر دیئے گئے۔ پانچ عرب مجاہدین چمن سے گرفتار بھی ہوئے اور ISI نے بتایا کہ چمن، ژوب اور چاغی کے علاقوں سے اور لوگوں کے آنے کا خطرہ ہے۔

CENTCOM کے کمانڈر جنرل ٹومی فرینکس جب پاکستان آتے، مجھے خوش آمدید کہنے ایئرپورٹ جانا پڑتا، عموماً تو اسلام آباد سے ہو کر واپس چلے جاتے اور میری صرف ایئرپورٹ پر سرسری سی ملاقات ہوتی۔ کبھی کبھار GHQ جنرل یوسف سے ملنے بھی آ جاتے۔ جب پہلی مرتبہ مجھے ایئرپورٹ جانے کا کہا گیا تو میں نے جنرل یوسف سے کہا کہ میں بہت مصروف رہتا ہوں، GHQ میں کئی لیفٹیننٹ جنرل ہیں، کسی ایک کو یہ کام سونپ دیں۔ کہنے لگے، نہیں یہ ضروری ہے کہ آپ ہی انہیں لینے جائیں، ان کا فوج سے متعلق سارا کام آپ کے ہی نیچے آتا ہے۔

ایک مرتبہ جنرل مشرف MO آئے اور بتایا کہ امریکنوں کو خدشہ ہے کہ ہمارے علاقے میں جو غیر ملکی مجاہدین رہتے ہیں وہ بارڈر پار کر کے افغانستان میں نہ داخل ہو جائیں، ہمارے ملک سے امریکنوں پر حملہ نہیں ہونا چاہئے۔ اس سلسلے میں کچھ سپاہ کو FATA (Federally Administered Tribal Areas) میں بھیجا جائے۔ تاکہ وہ تمام غیر ملکیوں کو رجسٹر کر لیں۔ ہمیں پتا تو چلے کہ ہیں کتنے۔ میں نے کہا کہ اس میں افغان باشندے تو شامل نہیں ہو سکتے، کیونکہ یہ اس طرح کے غیر ملکی نہیں ہیں اور ان کو شامل کرنے میں بہت مسائل پیدا ہوں گے۔ انہوں نے کہا، نہیں افغانیوں کے علاوہ، دوسرے غیر ملکیوں کا حساب کتاب لگا لیں، پھر سوچتے ہیں کہ کیسے یقین کیا جائے کہ یہ بارڈر پار نہیں جائیں گے۔ کیا ان کو کسی ایک جگہ اکٹھا کر لیں یا کچھ اور طریقہ کریں۔ پہلے تو اس بات کا تعین کر لیں کہ ہیں کتنے اور کہاں ہیں۔ اس کام کے لئے پشاور کے کور کو احکامات جاری کر دیئے گئے۔

غیر ملکی مجاہدین کے سلسلے میں جنرل ٹومی فرینکس بھی GHQ آئے۔ کہنے لگے۔ "اپنے تالاب کو مگرمچھوں (غیر ملکی مجاہدین) سے خالی کر لیں تاکہ آپ کی مچھلیاں (ہماری آبادی) سکون سے رہ سکیں۔ ہمارے اور آپ کے لیے یہ بہت اہم مسئلہ ہے، اس میں دونوں کا بہت نقصان ہو سکتا ہے۔"

لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کا شمار افواج پاکستان کے مایہ ناز، بلند ہمت، باکردار اور اصول پسند افسران میں ہوتا ہے۔ انہیں جس قدر کامیابیاں حاصل ہوئیں، اس کی وجہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر مکمل یقین ہے۔ جہاں کہیں بھی وطن عزیز کے دفاع اور قومی مفادات کا معاملہ سامنے آیا، وہ حکمرانوں کے سامنے بڑی جرأت اور استقامت سے حاضر سروس جنرل ہوتے ہوئے بھی اختلافی رائے پیش کرتے رہے۔ ڈائریکٹر جنرل تجزیاتی ونگ کی حیثیت سے کارگل کے محاذ کے حوالے سے انہوں نے ہمیشہ حقیقت پسندانہ تجزیہ اعلیٰ فوجی حکام کو مہیا کیا۔ نائن الیون (11/9) کے بعد امریکہ کیلئے فوجی سہولتوں کی فراہمی کے معاملے پر بھی اعلیٰ سطحی فوجی اجلاس میں کھل کر کلمہ حق بلند کیا۔ ان کی ملازمت کا عرصہ فیض کے اس مصرعے کی عملی تفسیر رہا:

جو رکے تو کوہِ گراں تھے ہم، جو چلے تو جاں سے گزر گئے

لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کی اجازت سے، ان کی کتاب "یہ خاموشی کہاں تک" سے منتخب اقتباسات قارئین کی معلومات اور دلچسپی کے لیے پیش کیے جا رہے ہیں۔

امریکہ کی فوجیں شمال سے طالبان کو دھکیلتی ہوئی نیچے لے آئیں۔ پھر انہیں گھیر کر ہمارے بارڈر کے ساتھ تورا بورا (Tora Bora) کی پہاڑیوں کی طرف دھکیل دیا، اور اپنی کارروائیاں کچھ دنوں کے لئے روکے رکھیں، تاکہ طالبان کی بچی کھچی سپاہ بھی یہیں پہنچ جائے۔ ان پہاڑوں میں غاروں کے کئی سلسلے بنے تھے جن سے امریکی بخوبی واقف تھے، کیونکہ سوویت یونین کے خلاف مجاہدین کو یہاں سے CIA اور ISI بھیجا کرتی تھیں۔ امریکی حکام کے مطابق اب اسامہ بن لادن اور القاعدہ کی تمام اعلیٰ قیادت اس علاقے میں تھی اور CIA کے پاس اس کی مکمل اطلاع موجود تھی، مگر انہیں گھیرے میں لینے اور پکڑنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی، بلکہ پاکستان میں داخل ہونے کے راستے اور مواقع فراہم کئے گئے۔

ہمیں کسی بات کی کوئی خبر نہ لگنے دی اور مگرمچھ ڈھونڈنے کے کام پر لگائے رکھا۔ جب تورا بورا پر گھیرا تنگ کیا اور امریکی لڑاکا طیاروں نے شدید بمباری سے ان غاروں کے سلسلے کو تباہ کرنا شروع کیا جہاں جہادیوں نے پناہ لی ہوئی تھی، تو یہاں سے بچے کھچے جہادی پاکستان میں داخل ہونے لگے۔ دسمبر 2001ء کے وسط میں خفیہ اداروں سے خبر ملی کہ کافی مجاہدین سرحد کے پار تورا بورا کے علاقے سے پاکستان میں داخل ہو رہے ہیں۔ پھر پشاور کی کور نے بھی اس کی تصدیق کی۔

18 دسمبر کو خبر ملی کہ جنرل ٹومی فرینکس کا CE کو فون آیا تھا کہ بارڈروں پر اپنی کارروائی کا ارتباط ہماری فوج سے کر لیں۔ اب کیا ارتباط ہو سکتا تھا، اس کا وقت تو گزر چکا تھا۔ دودھ بہہ چکا تھا، اب زمین ہی چاٹ سکتے تھے۔ فوری طور پر کچھ سپاہ کو بارڈروں کی جانب روانہ کیا گیا۔ یہ پہاڑی سلسلہ بہت اونچا تھا اور ان دنوں برف سے ڈھکا ہوا۔ پشاور کی کور کے پاس برفانی علاقوں میں کارروائیوں کے لئے کپڑے تک نہیں تھے، FC کے لوگ بے چارے شلوار قمیض اور چپلوں میں ہی برف پوش پہاڑوں پر چڑھ دوڑے۔ FCNA گلگت کا سامان کچھ راولپنڈی اور کچھ گلگت سے منگوایا، مگر ان تک پہنچتے پہنچتے کافی وقت صرف ہو گیا۔ جب تک سپاہ پہاڑوں پر صف آرا ہوئی، تمام مجاہدین پہلے ہی بارڈر پار کر چکے تھے۔ پھر آہستہ آہستہ FATA کے علاقے میں فوج کی تعداد بڑھتی رہی۔

قریب دو سو مجاہدین پاکستان کے اندرونی علاقوں سے حراست میں لئے گئے۔ وہ پکڑے بھی اس لئے گئے کہ ہم سے چھپ نہیں رہے تھے، سمجھتے تھے کہ ہم محفوظ مقام پر پہنچ گئے ہیں۔ ان کو بسوں میں بٹھا کر جب پیچھے منتقل کیا جا رہا تھا تو ایک بس میں انہوں نے ڈرائیور اور گارڈ پر قابو پا لیا اور بس سے اتر کر فرار ہو گئے۔ پھر ان کو ڈھونڈا گیا، باقی تو پکڑے گئے لیکن 6 غائب ہو گئے۔ نہ جانے اور کتنے تھے جو ہم سے چھپ گئے۔

جب اگلی ملاقات میں جنرل ٹومی فرینکس سے میں نے پوچھا کہ ہمیں کیوں نہ بتایا گیا کہ آپ کی فوج یہ کارروائی کرنے لگی ہے، تو معذرت سے کہا کہ کچھ ارتباط میں دیر ہو گئی۔ لڑائی میں ایسی غلطیاں ہوتی رہتی ہیں۔ یہ بات کسی صورت مانی نہیں جا سکتی۔ لڑائیوں کے منصوبے اس طرح بغیر سوچے سمجھے نہیں بنائے جاتے۔ یہ تو ایک سوچی ہوئی تدبیر کے مطابق عین موقع پر ہمیں ڈائیورٹ (divert) کیا گیا، کہ ہم غیر ملکیوں کی گنتی میں لگ جائیں اور ہمارا دھیان دوسری طرف ہو جائے، تاکہ ان مجاہدین کو پاکستان میں دھکیلا جا سکے۔

☆☆☆☆☆

روزنامہ امت کراچی/حیدرآباد

قسط نمبر 10

’افغانستان کے بعد کشمیر پر بھی یوٹرن لے لیا گیا‘

مشرف کشمیر سے زیادہ بھارت کیساتھ کاروباری مراسم بڑھانے پر زور دیتے-عوامی ردعمل کے خوف سے کھل کر موقف کا اظہار نہیں کیا-امریکہ کیخلاف باتیں سننا بھی پسند نہیں کرتے تھے-دہشت گردی کیخلاف جنگ کو پاکستان تک پھیلانا امریکی سازش کا حصہ تھا- لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کی کتاب سے اقتباسات
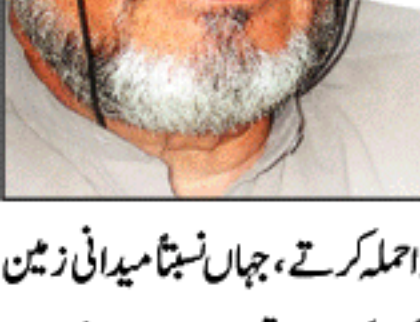
افغانستان پر حملے کا منصوبہ صرف روایتی فوجی منطق پر نہیں بنا تھا۔ اس کے کچھ اور بھی مقاصد تھے، جو اس وقت نظر نہیں آتے تھے۔ طالبان کی فوج کا سارا رجحان شمال کی جانب تھا، ان کی سپاہ کا جھکاؤ بھی ادھر ہی تھا، کیونکہ وہ شمالی اتحاد (Northern Alliance) سے لڑ رہے تھے۔ جبکہ ان کی ساری سپلائی لائن پاکستان کی طرف سے جاتی تھی۔ امریکہ کی بھی ساری سپلائی لائن پاکستان سے جاتی تھی۔ یہیں ان کے اڈے بھی تھے۔ موزوں منصوبہ یہ ہوتا کہ شمال میں شمالی اتحاد سے مل کر طالبان کو اس غلط فہمی میں رکھتے کہ حملہ یہیں سے ہو گا۔ پھر حملہ پاکستان کی جانب سے کرتے۔ اس کے فوائد بہت تھے۔ یہاں سے کارروائیوں کیلئے زمینی راستے بھی آسان تھے، بہ نسبت شمالی راستوں کے۔ اگر پشاور کی جانب سے ایک اور چھوٹا حملہ کابل کی طرف بھی ہوتا، جو شمالی اتحاد کے حملے سے منسلک کیا جاتا تو طالبان کی ساری فوج ان ہی میں الجھ جاتی۔ پھر چمن کی طرف سے بڑا حملہ کرتے، جہاں نسبتاً میدانی زمین اور سپاہ سے خالی علاقے ملتے۔ بلوچستان میں اتنی رکاوٹ بھی نہ تھی۔ حملہ شروع ہوتے ہی طالبان کی سپلائی لائنیں کٹ جاتیں اور وہ حملے کے اس ہتھوڑے اور شمالی اتحاد کے سندان (anvil) کے درمیان پس جاتے۔ کوئی نکلنے نہ پاتا۔ اور نہ ہی ہماری طرف سے کوئی قبائلی امداد شروع ہو سکتی۔ اس وقت قبائلی علاقوں میں اتنی ہل چل بھی نہیں تھی۔ کچھ عرصے کیلئے امریکہ کی سپلائی کے راستوں کو محفوظ بنانا کوئی اتنا پیچیدہ مسئلہ نہیں تھا۔ یہ کہہ دینا کہ پاکستان کی فوج رکاوٹ ڈالتی یا یہ کہ ان پر اتنا بھروسہ نہیں تھا، غلط ہے۔ جنرل مشرف ہر طرح کی امداد دینے پر راضی تھے اور فوج ان کے حکم پر کاربند۔ کیا کہیں کبھی کوئی رکاوٹ ملی؟ انہوں نے اوپر سے حملہ شروع کیا اور پھر ہمیں بھی اس سے آگاہ نہ کیا کہ جب حملے کا ہتھوڑا نیچے پہنچا تو کوئی سندان موجود نہ تھا اور سب کو دھکیل کر پاکستان میں پہنچا دیا۔

اتنی بڑی غلطی فوجی نہیں کرتا، جو ایک عام انسان کو بھی نظر آ جائے۔ ایک آدمی تو منصوبہ نہیں بناتا، کتنے ہی لوگ اس میں شامل ہوں گے، کیا کسی کو یہ عام سی غلطی نظر نہیں آئی؟ اگر یہ غلطی تھی، پھر اس پر دوسری بھی ایک غلطی تھی کہ ہمیں تمام باتوں سے لاعلم رکھا گیا، جبکہ ان دونوں غلطیوں کا ایک ہی انجام ہوا، کہ سارے مجاہدین کو پاکستان میں محفوظ ٹھکانے ملے۔ یہ صرف ایک سوچا سمجھا منصوبہ تھا کہ پاکستان کو اس جنگ میں لپیٹ لیا جائے اور جنگ اس ڈھنگ سے کی جائے کہ پورے علاقے میں پھیل جائے اور لمبے عرصے تک جاری رہے۔ پھر آہستہ آہستہ پاکستان کو دباؤ میں لایا جائے۔ جنرل مشرف سے میں نے کہا کہ امریکی فوج نے ہمیں جان بوجھ کر اپنی کارروائیوں سے غافل رکھا، اور ہمارے لیے اتنی پیچیدگیاں پیدا کر دیں، ہم ان پر بھروسہ نہیں کر سکتے۔ میں نے کہا کہ وہ ہمارے دوست کیسے ہو سکتے ہیں، جبکہ انہوں نے ہمارے واحد دشمن، ہندوستان کو ہماری پیٹھ کے پیچھے لا بٹھایا ہے؟ نظر آتا ہے کہ ان کے عزائم ہمارے لیے خطرہ ہیں۔ وہ امریکنوں کے خلاف ایسی باتیں سننا پسند نہیں کرتے تھے۔ کہنے لگے کہ مفروضوں پر تو ہم ملک کی پالیسیاں نہیں بنا سکتے اور نہ ہی سازشی قیاس آرائیوں (conspiracy theories) پر یقین کر کے ہم امریکہ کو اپنا دشمن سمجھ سکتے ہیں۔ جو سامنے نظر آ رہا ہے اسی کے مطابق ملک چلانا ہو گا۔ شاید ان کے دل میں بھی ایسے خدشات ہوں، مگر اس نازک وقت پر کہہ نہ سکتے ہوں اور نہ ہی کسی کو کہنے کی اجازت دے سکتے ہوں۔

26 جنوری 2002ء کو ہماری ایک پلٹن کے تقریباً پچاس لوگ، ان کے ساتھ ایک SSG کی ٹیم، بمعہ چار امریکنوں کے، مگر مچھوں کی تلاش میں ایک گھر پر پہنچے۔ خبر ملی تھی کہ یہاں غیر ملکی مجاہدین موجود ہیں۔ کئی بار ایسی خبریں ملتیں مگر کچھ نکلتا نہیں۔ جب گھر پہنچ کر دروازہ کھٹکھٹایا تو ایک شخص نکلا۔ اس سے پوچھا کہ گھر میں کون کون ہے، تو اس نے کہا عورتیں اور بچے ہیں۔ کہا ہم تلاشی لینا چاہتے ہیں۔ جواب دیا ”ٹھہریں، عورتوں کو پردہ کرنے کا کہہ دوں“۔ یہ کہہ کر وہ اندر چلا گیا۔ کافی دیر تک واپس نہ آیا۔ پھر دروازہ کھٹکھٹانے کے بعد باہر نکلا اور کہا کہ اندر چلے جائیں۔ کچھ لوگ اندر داخل ہوئے۔ جب آنگن میں پہنچے تو وہاں موجود لوگوں نے فائر کھول دیا۔ کچھ تو وہیں گر گئے اور کچھ، جو دروازے کے قریب تھے، باہر بھاگ آئے۔ اس تمام کارروائی کی ایک افسر نے کیمرے سے ویڈیو بھی بنا لی، جو بعد میں سب نے دیکھی۔ پھر سپاہیوں نے گھر کا گھیرا ڈال لیا۔ رات دس بجے تک دونوں جانب سے فائر ہوتا رہا۔ پھر خاموشی ہو گئی۔ فائر بند ہونے کے کچھ دیر بعد یہ غیر ملکی جنگجو گھر سے نکلے اور سپاہیوں کا گھیرا توڑتے ہوئے کامیابی سے فرار ہو گئے۔ ایک سپاہی کی رائفل بھی ہاتھ سے چھین کر لے گئے۔ کوئی ہاتھ نہ آیا۔

یہ پہلا واقعہ تھا کہ فوج اور مجاہدین میں براہ راست فائر کا تبادلہ ہوا۔ اس واقعے کی باقاعدہ انکوائری ہوئی اور کئی افسران کو سزا ملی۔ اس کے بعد فوج اور زیادہ محتاط ہو گئی اور فائر کرنے میں پہل کا رجحان آنے لگا۔ گاہے بگاہے کہیں نہ کہیں فائر کا تبادلہ ہوتا رہتا۔ SSG کا پہلا آپریشن بھی اسی نوعیت کا رہا۔ کچھ غیر ملکی مجاہدین کو گھیرے میں لے لیا گیا، پھر انہیں میگا فون کے ذریعے بہت سمجھایا کہ ہتھیار ڈال دیں انہیں کچھ نہیں کہا جائے گا، مگر وہ صرف گولیوں سے جواب دیتے۔ آخر دم تک مجاہدین لڑتے رہے اور سب نے جان دے دی۔ ایک نے بھی ہتھیار نہ پھینکا۔ آخری زخمی لمبی گھاس میں چھپ گیا۔ SSG کے گھیرے میں پھنسا، گاہے بگاہے رات تک فائر کرتا رہا۔ صبح اس کی لاش ملی۔

13 دسمبر 2001 کو ہندوستان کی پارلیمنٹ بلڈنگ پر ایک مسلح گروہ نے حملہ کیا، اور ہم کو اس حملے کا مورد الزام ٹھہرایا گیا۔ پھر ہندوستان نے اپنی فوجیں ہمارے بارڈروں پر لگانی شروع کر دیں۔ ہمیں بھی دفاعی اقدام لینے پڑے۔ جنگ کا ڈنکا بجایا گیا۔ قوم کو بتایا گیا کہ سب میرے جھنڈے تلے اکٹھے ہو جاؤ، پاکستان کو خطرہ ہے، کسی وقت بھی جنگ ہو سکتی ہے۔ عجب اتفاق ہے کہ اس سے ایک ہی دن پہلے ملک کے چیف ایگزیکٹو نے ایک کانفرنس میں بتایا تھا کہ امریکہ کا کہنا ہے کہ ISI میں نچلے طبقوں میں اب بھی مجاہدین کی طرف داری کے اثرات موجود ہیں۔ دوسرے دن مجاہدین کی کارروائی ہو گئی۔ حکم دیا کہ جن لوگوں میں یہ رجحان نظر آئے انہیں فوراً تبدیل کر دیا جائے۔ جنرل مشرف نے کہا کہ ہم کسی بھی صورت اپنی سرزمین کو ”دہشت گردی“ کیلئے استعمال نہیں ہونے دیں گے۔ یہ بات وہ اس سے پہلے بھی کہہ چکے تھے۔ کشمیری مجاہدین بھی دہشت گرد قرار پا چکے تھے۔ جہاد بند کرا دیا گیا تھا اور فوج کو بھی یہی حکم تھا کہ کوئی بارڈر کے پار نہ جانے پائے۔ یہ سب پہلے ہی ہو چکا تھا، لیکن کھل کر عوام کے سامنے اس بات کا اظہار نہیں کیا گیا تھا، تاکہ لوگ مشتعل نہ ہوں۔ اب تک کشمیر کی جہادی تنظیمیں برقرار تھیں، مگر ان کو آہستہ آہستہ لپیٹا جا رہا تھا۔ افغانستان پر یوٹرن کے بعد، اتنی جلدی کشمیر کے جہاد سے ہاتھ اٹھانے پر حکمران کو عوام سے خوف آتا تھا، مگر کام جاری تھا۔

دہلی میں دھماکے کے بعد ہم دنیا کی نظروں میں مجرم بنے کہ اب تک دہشت گرد تنظیموں کی امداد کرتے ہیں۔ یہ بے بنیاد الزام جرم تھا۔ اس وقت تک پاکستان کشمیریوں کے جہاد کیلئے امداد بند کر چکا تھا اور امریکہ کو یقین دلا چکا تھا کہ آئندہ ایسا ہرگز نہیں ہو گا۔ ظاہر ہے، کشمیری مجاہدین کا کوئی ایک منظم گروہ تو تھا نہیں، کچھ نہ کچھ سر پھرے جان ہتھیلی پر لئے پھرتے تھے، اللہ کی راہ میں نکلے تھے، کسی کی کیوں سنتے۔ لیکن حکومت ہرگز اس میں ملوث نہیں تھی۔ پھر یہ دھماکے کرنا صرف مجاہدین کا ہی کام تو نہیں۔

16 دسمبر کو چاند رات تھی۔ جنرل مشرف کے گھر ایک میٹنگ بلوائی گئی۔ انہوں نے بتایا کہ امریکی سفیر نے ایک ڈیمارش (demarche) پیش کیا ہے جس میں مطالبہ کیا گیا ہے کہ لشکر طیبہ اور جیش محمد کیخلاف سخت کارروائی کی جائے، حزب المجاہدین کو بھی روکا جائے۔ ان تمام دہشت گرد تنظیموں کو غیر قانونی قرار دیا جائے۔ انہوں نے پڑھ کر سنایا۔ لکھا تھا کہ لشکر طیبہ اور جیش محمد امریکہ کے مفاد کو خطرہ ہیں اور یہ تنظیمیں جلد UNO کی دہشت گرد تنظیموں کی فہرست میں شامل ہو جائیں گی۔ پاکستان کے مفاد میں ہے کہ اس سے پہلے ان کیخلاف کارروائی کر لے۔ ابھی تک امریکہ نے پاکستان سے یہ مطالبات سرعام نہیں کئے ہیں، کیونکہ ہم چاہتے ہیں کہ پاکستان کیلئے دشواریاں نہ پیدا کریں۔ ڈیمارش میں مطالبہ کیا گیا کہ آزاد کشمیر میں تمام دہشت گرد تربیتی کیمپ فوری بند کر دیئے جائیں، ان کے اثاثے منجمد کئے جائیں اور اہم شخصیات کو قید کر دیا جائے۔

ڈیمارش پڑھ کر سنانے کے بعد جنرل مشرف نے کہا کہ ہم کسی صورت اپنی سرزمین کو دہشت گردی کیلئے استعمال نہیں ہونے دیں گے مگر کشمیر کی جنگ آزادی دہشتگردی نہیں ہے۔ ہم آہستہ آہستہ ان تنظیموں کو بند کریں گے۔ کہنے لگے، پہلے ہندوستان کو یہ قبول کرنا ہو گا کہ کشمیر ہی ہمارا اصل مسئلہ ہے اور ہم سے معنی خیز مذاکرات شروع کرنے ہوں گے۔ خارجہ سیکریٹری صاحب نے فرمایا کہ امریکہ دہشت گرد اور فریڈم فائٹرز میں فرق نہیں کرتا۔ اس سلسلے کی ہر میٹنگ میں دفتر خارجہ کا موقف واضح ہوتا۔ وہ امریکہ اور بھارت سے تعلقات بڑھانا چاہتے اور جہادی رجحان کی مخالفت کرتے۔ کشمیر کی جنگ آزادی کے سخت خلاف تھے اور کشمیر کے مسئلے کو پیچھے رکھتے ہوئے، بھارت سے کاروباری مراسم بڑھانے پر زور دیتے۔ جنرل مشرف کا بھی یہی نکتہ نظر ہوتا، مگر کھل کر نہ کہتے۔ (جاری ہے)

☆☆☆☆☆

"مشرف نے امریکی دباؤ پر کشمیری مجاہدین کی امداد بند کی تھی"

بھارت سے جنگ کا خطرہ پیدا کر کے قوم کو امریکہ نواز پالیسی پر رضا مند کیا گیا - امریکی پاکستان کو دہشت گردی کا مرکز قرار دینے میں کامیاب رہے بھارت کو خطے کی بڑی طاقت کے طور پر منوانا بھی ہدف میں شامل تھا - اسی لئے کشمیر کی جنگ آزادی دہشت گردی قرار پائی - لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز

لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کا شمار افواج پاکستان کے مایہ ناز، بلند ہمت، باکردار اور اصول پسند افسران میں ہوتا ہے۔ انہیں جس قدر کامیابیاں حاصل ہوئیں، اس کی وجہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر مکمل یقین ہے۔ جہاں کہیں بھی وطن عزیز کے دفاع اور قومی مفادات کا معاملہ سامنے آیا، وہ حکمرانوں کے سامنے بڑی جرأت اور استقامت سے حاضر سروس جنرل ہوتے ہوئے بھی اختلافی رائے پیش کرتے رہے۔ ڈائریکٹر جنرل تجزیاتی ونگ کی حیثیت سے کارگل کے محاذ کے حوالے سے انہوں نے ہمیشہ حقیقت پسندانہ تجزیہ اعلیٰ فوجی حکام کو مہیا کیا۔ نائن الیون (11/9) کے بعد امریکہ کیلئے فوجی سہولتوں کی فراہمی کے معاملے پر بھی اعلیٰ سطحی فوجی اجلاس میں کھل کر کلمہ حق بلند کیا۔ ان کی ملازمت کا عرصہ فیض کے اس مصرعے کی عملی تفسیر رہا:

جو رکے تو کوہِ گراں تھے ہم، جو چلے تو جاں سے گزر گئے

لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کی اجازت سے، ان کی کتاب "یہ خاموشی کہاں تک" سے منتخب اقتباسات قارئین کی معلومات اور دلچسپی کے لیے پیش کیے جا رہے ہیں۔

میں نے جنرل مشرف سے ایک مرتبہ کہا کہ جب کشمیر پر ہمارا موقف درست ہے اور اس پر UNO کی قراردادیں بھی موجود ہیں تو ہم اسے دہشت گردی سے کیوں ملاتے ہیں؟ ہمارا مطالبہ ہونا چاہئے کہ اگر ہندوستان کشمیریوں کو سیاسی آزادی کا حق دیتا ہے، تو ہم بھی مجاہدین کو روک لیں گے۔ کشمیریوں کا حق دنیا نے قبول کیا ہے۔ اگر انہیں سیاست میں بھی آزادی نہیں اور آواز بھی بلند نہیں کر سکتے تو پھر ان کے پاس لڑنے کے سوا چارا ہی کیا ہے۔ کشمیر میں تو میڈیا اور انسانی حقوق کی تنظیموں کو بھی جانے کی آزادی نہیں۔ کہنے لگے درست ہے، مگر دنیا اس وقت صرف دہشت گردی کے خلاف متحد ہے اور نان اسٹیٹ ایکٹرز (non state actors) کی فوجی کارروائیاں دہشت گردی کہلاتی ہیں۔ کوئی یہ بات سننے کیلئے تیار نہیں ہوگا۔

پھر میں نے مشورہ دیا کہ اگر تمام کشمیری مجاہدین کو گھر بھیج دیا جائے تو ہماری یہ صلاحیت ختم ہو جائے گی، نہ جانے کل حالات کیسے ہوں۔ یہ بھی خدشہ رہے گا کہ وہ کسی اور تخریبی کارروائیوں میں ملوث ہو جائیں اور ہمارے لئے کوئی نئی مصیبت کھڑی کر دیں، انہیں لڑنے کے سوا آتا ہی کیا ہے۔ امریکہ کو نان سٹیٹ ایکٹرز سے اختلاف ہے، تو ہم انہیں بھرتی کر لیتے ہیں اور ان کی مجاہدین بٹالین بنا لیتے ہیں۔ انہیں کشمیر سے دور کسی جگہ تربیت کیلئے رکھ لیتے ہیں۔ ان کی خدمت کے صلے میں ان کی روزی بھی جاری رہے گی، ہمارے قابو میں بھی رہیں گے اور ہماری صلاحیت بھی برقرار رہے گی۔ ہماری فوج میں نیم فوجی مجاہد بٹالین پہلے سے بھی موجود ہیں، کوئی نئی چیز نہیں۔ آخر ساری بڑی بڑی افواج میں اسپیشل فورسز (مخصوص نوعیت کی سپاہ) ہوتی ہیں، یہ بھی ایک قسم کی اسپیشل فورس ہوگی۔ کہنے لگے نہیں یہ آج کل کے حالات میں ہم نہیں کر سکتے۔

آہستہ آہستہ بارڈر پر ہندوستان کی فوجی صلاحیت بڑھتی جا رہی تھی۔ دفاعی اقدام لینا لازم تھا۔ فوج کا اصول ہے کہ دشمن کی صلاحیت کا جواب دیا جائے، چاہے اس کا ارادہ نظر نہ آتا ہو، کیونکہ ارادہ تو کبھی بھی بدل سکتا ہے۔ لیکن ایک اور چیز جو ذہن میں رکھنی چاہئے وہ یہ کہ اگر آپ اس کا ارادہ صحیح طرح نہ بھانپ سکیں تو اس دھمکی اور دباؤ کے کھیل میں، جو ابھی چل رہا تھا، نقصان اٹھا سکتے ہیں۔

حقیقت میں جنگ کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اس فوجی دباؤ کے مقاصد اور تھے۔ البتہ اس مرتبہ کارگل کے تجربے کے بعد ان کی فوجی صف آرائی کا ڈھونگ کھل گیا تھا۔ انہوں نے تقریباً پوری فوج بارڈر پر لگا دی۔ بارودی سرنگیں بھی بچھائیں، تاکہ جھوٹ چھپ سکے۔ مگر جنگ کا خدشہ صرف مکا دکھانے سے نہیں پیدا ہوتا۔ جنگ کے کچھ حالات ہوتے ہیں اور کچھ مقاصد۔ اگر ان کا تجزیہ کیا جائے تو کافی حد تک دیکھا جا سکتا ہے کہ آیا جنگ ہی دشمن کے مفاد میں ہے یا فوجی دباؤ کے کچھ اور مقاصد بھی ہو سکتے ہیں۔

یہ وہ وقت تھا کہ دہشت گردی کے خلاف پاکستان اور امریکہ کا تعاون جاری تھا۔ پاکستان امریکہ کی ہر فرمائش پوری کرنے پر آمادہ تھا، اور کر رہا تھا۔ کشمیر کے جہاد کی امداد امریکہ کے ہی دباؤ پر ختم کی گئی تھی۔ اس میں بھارت کا براہ راست کوئی کردار نہیں تھا۔ پھر بھارت مجاہدین کا دباؤ سالہا سال سے برداشت کر رہا تھا، کوئی نیا کھیل نہیں تھا، اور اب تو بند بھی کر دیا گیا تھا۔ اگر خدشہ تھا کہ پاکستان کشمیری مجاہدین کے سلسلے میں دھوکہ دے رہا ہے، تو امریکہ کافی تھا اس کی گردن مروڑنے کو۔ امریکہ کا دباؤ بہت کارگر تھا۔ اور جو مقصد جنگ کے بغیر حل ہو سکتا ہو اس کے لئے کون نامعقول دو ایٹمی ملکوں کو جنگ میں دھکیلے گا؟ یہ جنگ کیلئے معقول وجہ (sufficient cause) نہیں تھی۔

اگر بھارت جنگ شروع کر دیتا تو لامحالا ہمیں مغربی سرحدوں سے تمام افواج اٹھا کر بھارت کے بارڈر پر لے جانی پڑتیں۔ فوج بھی اور FC بھی۔ پاکستان کی سرزمین سے افغان مجاہدین کی امداد کون روکتا؟ اور بھارت سے کامیاب جنگ کرنے کیلئے مجاہدین ایک بار پھر ہمارے بھائی بن جاتے۔ کشمیر کا جہاد پھر جائز ہو جاتا۔ بمشکل تو امریکہ کے دباؤ سے انہیں مجاہد کے رتبے سے گرا کر ملعون کیا تھا۔ تو جس بلا کو ختم کرنے ہندوستان اٹھ کھڑا ہوا تھا، وہ جنگ کے نتیجے میں اور بڑی ہو جاتی۔ کیا حاصل ہوتا؟ اور پھر ابھی تو پاکستان عوام کا دل مغربی تہذیب کی طرف مائل کرنا ہی شروع کیا تھا، وہ پھر سے اللہ اکبر کے نعرے لگانے لگتے۔

تو ایسے میں امریکہ اور اس کے اتحادیوں کی دہشت گردی کے خلاف جنگ پر کیا اثرات نکلتے؟ کیا امریکہ کو یہ قبول ہو سکتا تھا؟ کیا بھارت امریکہ اور اس کے ساتھیوں کے کھیل کو تباہ کر کے اور ان کو ناراض کر کے کامیابی حاصل کر سکتا تھا؟ اس کی اٹھتی ہوئی معیشت کا کیا ہوتا؟ وہ کام جو امریکہ خود ہی، بغیر معاوضہ کے کر رہا تھا، اس کیلئے جنگ کا خطرہ مول لے کر اتنا بڑا فتنہ وہ اپنے لئے اور دنیا کیلئے کیونکر کھڑا کر سکتا تھا، جس میں کچھ حاصل ہونے کے بجائے انجام الٹا ہی نکلتا۔

بھارت نے تو شروع دن سے ہی امریکہ کو کہا تھا کہ آپ یہاں آئیں اور کھیل یہاں سے شروع کریں، تاکہ وہ اس کھیل کا حصہ ہو۔ 1971ء کے بعد اب بقایا پاکستان کا بھی صفایا کیا جائے، اور بھارت اس خطے کی واحد بڑی طاقت بن کر ابھر سکے۔ یہ چونکہ ہو نہ سکا، اب وہ اس کھیل میں کودنا چاہ رہا تھا کہ دنیا کو باور کرائے کہ اس خطے میں بھارت ہی بڑی طاقت ہے اور یہاں جو کچھ بھی ہوگا بھارت کی شمولیت سے ہی ہوگا۔ اور پاکستان کو دونوں طرف سے گھیرے میں رکھ کر دنیا کو یہ بھی دکھائے کہ اس کے ہوتے ہوئے پاکستان کی کیا مجال کہ امریکہ کا کھل کر ساتھ نہ دے! وہ پاکستان کو مجبور کرے گا کہ اس جنگ میں امریکہ سے بھرپور تعاون کرے۔ دنیا کو پتہ ہوگا کہ دہشت گردی کے خلاف اس جنگ میں بھارت ایک بڑا کھلاڑی ہے۔ اس طرح پاکستان کے خلاف اس کھیل میں بھارت نے خود کو حصے دار بنایا، اور خطے میں بڑی طاقت کے طور پر اپنا لوہا منوایا۔ دوسرا ہدف یہ تھا کہ دنیا کھل کر اس بات کو تسلیم کرے کہ کشمیر کی جنگ آزادی دہشت گردی ہے، اور یہ کہ بھارت عرصہ دراز سے پاکستان کے ہاتھوں اس ظلم کا سامنا کر رہا ہے۔ اب تک دنیا کشمیری مجاہدین کی کارروائیوں پر خاموش تھی اور بھارت کے موقف کو تسلیم نہیں کیا گیا تھا۔ یہ بحث چل رہی تھی کہ جنگ آزادی اور دہشت گردی میں کیسے تفریق کی جائے، حتیٰ کہ دہشت گردی کی تعریف پر ہی اتفاق نہیں تھا۔ سالہا سال سے بھارت اس جہاد کے خلاف دنیا کے آگے کھل کر آواز نہیں اٹھا سکتا تھا۔ خود جو مجرم تھا، پھنسا ہوا تھا۔ جو ظلم وہ آزادی کی اس جدوجہد پر ڈھا رہا تھا، جسے تاریخ کی روشنی میں دنیا جائز سمجھتی تھی۔ 11/9 کے بعد اب دنیا میں وہ ظلم جائز اور آزادی کی جدوجہد ناجائز سمجھی جانے لگی۔ اب کشمیر کا مسئلہ بھی ختم ہوا۔ اب صرف اس کی باتیں ہی کر سکتے ہیں۔ اس راہ پر چلتے چلتے، آج پاکستان کے پاس کوئی اور راستہ نہیں سوائے اس کے کہ کشمیر پر زبانی جمع خرچ کرتا رہے، جس کا نہ کوئی حاصل، نہ وصول۔ امریکہ کے کھیل میں بھی بھارت کی فوج کشی موزوں تھی، کہ خطے میں جنگ کے بادل دکھائے جائیں، اور یہ چال ان کی مرضی کے بغیر وقوع پذیر ہو نہیں سکتی تھی۔ پاکستان اور بھارت کی جنگ کے خدشے سے دنیا گھبراتی ہے۔ کارگل کے بعد پاکستان سے لوگ اور بھی خائف تھے، اور وہاں بھی ہم نے مجاہدین کا ہی جھوٹا کھیل کھیلا تھا۔ پھر اب پاکستان کو اس رنگ میں بھی دکھانا تھا کہ دنیا میں دہشت گردی کا یہی خطرناک گڑھ ہے، جس نے سب کی ناک میں دم کیا ہوا ہے۔ اور یہ ایٹمی طاقت ہے، جس کی موجودہ حالت اور رجحانات کے خوفناک نتائج نکل سکتے ہیں۔ بھارت کو ساتھ ملائے بغیر یہ سب نہیں ہو سکتا تھا، اور ملانا یوں بھی لازم تھا کہ اس خطے میں آئندہ کے تمام کھیلوں میں یہی امریکہ کا ساتھ دے سکتا تھا۔ شروع سے ہی بڑی تعداد میں انہیں افغانستان میں داخل کر لیا گیا تھا۔ انڈیا ہی جنوبی ایشیا کے تیل اور گیس کے ذخائر پر قبضہ کرنے اور چین کی ابھرتی ہوئی طاقت اور اس کا روس سے الحاق روکنے کیلئے امریکہ کا بڑا منصوبہ ساز ساتھی (strategic partner) بننے کا اہل ہو سکتا تھا۔ پھر امریکہ کا ساتھ دینے پر پاکستان کے عوام کی چوں چرا بھی اس جنگ کے خطرے سے بند ہوئی۔ ہماری حکومت کیلئے بھی یہی قرین مصلحت تھا، چونکہ اس وقت جب کہ امریکہ کا ساتھ دینے پر قوم میں کافی تحفظات تھے، اس جنگ کے خطرے کی تصویر سے قوم کو امریکہ نواز پالیسی کے پیچھے اکٹھا کرنے میں مدد ملی۔ جنگ کا یہ دباؤ ہماری عوام پر تھا، تاکہ اس گھبراہٹ میں سب ہی حکومت کے پیچھے کھڑے ہو جائیں، حکمران کے ہاتھ مضبوط ہوں اور مجاہدین کے خلاف کھل کر کارروائیاں کی جا سکیں۔ جنرل مشرف کیلئے یہ ایک تحفہ ثابت ہوا۔ جنگ کے خدشے سے لوگوں نے اور بہت کچھ نظر انداز کر دیا اور مشرف صاحب ایک مدبر کی حیثیت سے ابھرے، جنہوں نے اس دوہرے خطرے کے درمیان سے ملک کو بچا کر نکالا۔ تینوں فریق ہی اس صف آرائی سے مستفید ہوئے۔ (جاری ہے)

☆☆☆☆☆

بدھ 13 فروری 2013ء
روزنامہ امت کراچی/حیدرآباد

مشرف نے کشمیر پر بھارت کو دباؤ میں لینے کا موقع ضائع کر دیا'

دسمبر 2001ء میں کشمیر پر حملے کا خدشہ تھا- بھارت کو برابر کا جواب دینے کی میری تجویز نہ صرف مسترد کر دی گئی بلکہ مولانا مسعود اظہر اور جیش محمد پر پابندی لگانے کا حکم دیدیا گیا- اپنے مطالبات منوا کر بھارت نے کشمیر سے فوج واپس بلائی تو مشرف نے اسے اپنی ''جیت'' قرار دیا- لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کی کتاب سے اقتباسات

لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کا شمار افواج پاکستان کے مایہ ناز، بلند ہمت، باکردار اور اصول پسند افسران میں ہوتا ہے۔ انہیں جس قدر کامیابیاں حاصل ہوئیں، اس کی وجہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر مکمل یقین ہے۔ جہاں کہیں بھی وطن عزیز کے دفاع اور قومی مفادات کا معاملہ سامنے آیا، وہ حکمرانوں کے سامنے بڑی جرأت اور استقامت سے حاضر سروس جنرل ہوتے ہوئے بھی اختلافی رائے پیش کرتے رہے۔ ڈائریکٹر جنرل تجزیاتی ونگ کی حیثیت سے کارگل کے محاذ کے حوالے سے انہوں نے ہمیشہ حقیقت پسندانہ تجزیہ اعلیٰ فوجی حکام کو مہیا کیا۔ نائن الیون (11/9) کے بعد امریکہ کیلئے فوجی سہولتوں کی فراہمی کے معاملے پر بھی اعلیٰ سطحی فوجی اجلاس میں کھل کر کلمہ حق بلند کیا۔ ان کی ملازمت کا عرصہ فیض کے اس مصرعے کی عملی تفسیر رہا:

جو رکے تو کوہِ گراں تھے ہم، جو چلے تو جاں سے گزر گئے

لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کی اجازت سے، ان کی کتاب ''یہ خاموشی کہاں تک'' سے منتخب اقتباسات قارئین کی معلومات اور دلچسپی کے لیے پیش کیے جا رہے ہیں۔

کُل جنگ کا خطرہ تو نہ تھا، مگر کچھ نہ کچھ muscle flexing کی گنجائش ضرور تھی۔ ان دنوں اس سلسلے میں کئی میٹنگز ہوئیں۔ 24 دسمبر 2001ء کو جوائنٹ چیف آف سٹاف کمیٹی (JCSC) کی میٹنگ ہوئی۔ تجزیہ تھا کہ بھارت کشمیر میں محدود کارروائی کر سکتا ہے، اور زیادہ خدشہ صرف فضائی حملے کا ہے۔ کسی جگہ حملہ کر کے کہہ سکتا ہے کہ ہم نے مجاہدین کے تربیتی کیمپ پر حملہ کیا ہے۔ یہ بھی خیال تھا کہ امریکہ ہندوستان کو کشمیر کے علاقے میں مظاہرے کے طور پر تعزیری کارروائی (demonstrative punitive strike) سے نہیں روکے گا، مگر صرف کشمیر میں فضائی حملہ بھارت کیلئے فوجی لحاظ سے سودمند نہیں تھا۔ محدود کارروائی میں پاکستان کے جواب برابر کے ہو سکتے تھے۔ اس لئے باز رہا۔

پھر اسی رات CE نے ایک اور میٹنگ بلوائی، جس میں خارجہ امور کے وزیر نے بتایا کہ امریکہ اور برطانیہ نے کہا کہ اس کے پاس ثبوت موجود ہیں کہ لشکر طیبہ اور جیش محمد ہندوستان میں ISI کی مدد سے دہشت گردی کر رہے ہیں، اور ان دونوں کا بہت دباؤ ہے کہ ہم ان تنظیموں کے خلاف کارروائی کریں۔ خارجہ سیکریٹری صاحب نے کہا کہ جب تک ہم کچھ کرتے نہیں، تمام مغربی ممالک ہم پر دباؤ بڑھاتے رہیں گے، چاہے ثبوت ہو یا نہ ہو۔ CE صاحب نے احکام دیئے کہ اظہر مسعود کو قید کر دیا جائے اور جیش محمد کو غیر قانونی قرار دیا جائے۔

میرا نکتہ نظر تھا کہ یہ ظاہر کر دیا جائے کہ کشمیر افغانستان نہیں ہے، اور یہاں آزادی کی جدوجہد ہو رہی ہے، دہشت گردی نہیں۔ میری سوچ تھی کہ آج پاکستان دنیا کی دہشت گردی کے خلاف جنگ میں نہایت اہم کردار رکھتا ہے، ابھی امریکہ نے افغانستان میں قدم رکھا ہی ہے، اسے ہماری بہت ضرورت ہے۔ ہم اس میں سے کچھ تو اپنا فائدہ نکالیں۔ اگر ہم ہندوستان کے دباؤ کے آگے کشمیر پر اپنے موقف سے ہٹ گئے تو کشمیر کا معاملہ ہمیشہ کیلئے لپیٹ دیا جائے گا۔ بہتر یہ ہے کہ اگر بھارت کشمیر میں محدود جنگ کا آغاز کرتا ہے، تو ہم شروع میں تو اس کی کارروائیوں کا برابر کا جواب دیں۔ پھر مجاہدین کی کارروائیوں میں یک دم اضافہ کر دیں اور معاملے کو اس حد تک بڑھا دیں کہ اس کا حل کرنا ناگزیر ہو جائے۔

میرا خیال تھا کہ یہی موقع ہے کہ دنیا کو کشمیر کا مسئلہ حل کرانے کیلئے دباؤ میں لایا جا سکتا ہے۔ اگر بھارت ہمیں یہ موقع فراہم کرتا ہے تو ہمیں اس کا فائدہ اٹھانا چاہئے۔ ہمیں سمجھنا چاہئے کہ جنگ کا یہ ڈھونگ نقلی ہے اور دبکنے کے بجائے ان حالات کو اپنے مفاد میں استعمال کرنا چاہئے۔ دہشت گردی ختم کرنے کا جو دباؤ دنیا ڈال رہی ہے، اسی کو استعمال کرتے ہوئے ہم کشمیر کے مسئلے کو حل کریں، جیسے جاپان کی سوموکشتی (sumo wrestling) میں ہوتا ہے کہ دشمن کے دھکے کے زور پر ہی اسے گرایا جاتا ہے۔

دنیا پہلے ہی مانتی ہے کہ پاکستان کے نان اسٹیٹ ایکٹرز کی کارروائیوں کی جڑ کشمیر کا مسئلہ ہے۔ دنیا کو دکھائیں کہ جنگ اس کا حل نہیں ہے۔ جنگ کے خدشے کی وجہ سے یہ اور بڑھ گئی ہیں۔ واضح کر دیں کہ اس کا مداوا صرف مسئلے کے مکمل حل سے ہی ہو سکتا ہے۔ جب بات یہاں تک پہنچ جائے گی، اور مجاہدین کی کارروائیاں عروج پر ہوں گی، تو اور کوئی راستہ واپسی کا نہیں رہ جائے گا۔ جب دشمن ہمیں میدان جنگ میں گھسیٹ ہی لایا ہے تو پھر اس کو بھی اس کا مزا چکھائیں۔ ہم سے آگ کا کھیل کھیلتا ہے، تو قیمت بھی چکائے۔ اگر ہم پیچھے ہٹ گئے اور ایسا نہ کیا تو اس کے بعد کوئی معنی خیز پیش رفت کشمیر کے سلسلے میں نہیں ہو سکے گی۔ حقیقت پسندی یہ ہے کہ مذاکرات سے کبھی کچھ حل نہیں ہوگا۔ یہ ایک ڈھونگ کے طور پر دونوں اطراف سے کئے جاتے رہیں گے۔ یا ابھی قدم اٹھائیں، یا پھر بھول جائیں۔ مگر یہ بات کسی کو بھی پسند نہ تھی۔ یہ بہترین موقع تھا، ایٹمی طاقت کی آڑ لینے کا، جس سے مکمل جنگ کا خطرہ ٹلا رہتا۔ آج ہم کمزور دلوں کو لئے کہتے پھرتے ہیں کہ یہ طاقت ہماری کمزوری ہے۔

میں نے GHQ کی ایک میٹنگ میں بھی چیف صاحب سے اپنے تحفظات کا اظہار کیا اور کہا کہ ہمیں اس جھوٹے دباؤ میں آ کر کشمیر پر اپنے موقف سے نہیں ہٹنا چاہئے۔ میرا کہنا تھا کہ اس ناانصافی اور ظلم کے خلاف اگر آج آواز نہ اٹھائی گئی تو یہ آواز ہمیشہ کیلئے بند ہو جائے گی۔ مگر انہوں نے میرے اس خیال سے اتفاق نہیں کیا کہ جنگ کا خدشہ نہیں اور کہا کہ کوئی کشمیر کے جہاد کو جائز نہیں سمجھتا۔ دنیا اسے دہشت گردی ہی مانتی ہے۔ خود جب ہماری قیادت جہاد کے تصور سے شرمندہ ہوگی تو دنیا کو کیا منائیں گے۔ جب میٹنگ سے باہر آئے تو جنرل یوسف کہنے لگے کہ ایسی باتیں مت کرو۔ فوج میدان جنگ میں کھڑی ہے اور فوج کا CGS کہتا ہے کہ جنگ کا خطرہ نہیں، فوج کے مورال (morale) پر برا اثر پڑے گا۔ میں نے کہا کہ میں اعلانیہ تو نہیں کہہ رہا، لیکن فوج کی اعلیٰ قیادت کو تو یہ باتیں سمجھنی چاہئیں تاکہ درست فیصلے کر سکیں، دشمن کے دباؤ میں آ کر نہ سوچیں۔ ہم دفاعی طرز (back foot) پر کیوں کھیل رہے ہیں؟ کیا یوں پسپائی اختیار کرنا کسی بھی فوج کا شیوہ ہونا چاہئے؟

جنرل مشرف کا خیال تھا کہ یہ وقت ایسا نہیں کہ ہم کشمیر کے سلسلے میں کوئی بھی مطالبہ کر سکیں، ان کا کہنا تھا کہ ہم خود اس وقت دباؤ میں ہیں کہ دہشت گردی بند کریں۔ کہتے تھے کہ کشمیر کا حل صرف پُرامن مذاکرات کے ذریعے ہی ممکن ہے، اور دنیا ہمیں کشمیر کی آڑ میں دہشت گردی کرنے کی اجازت نہیں دے گی۔ یہاں بھی مذاکرات کا تقاضا صرف ایک آڑ ہی تھا، جس کے پیچھے چھپ کر کشمیر کو خیرآباد کہا جا سکے۔ جن مذاکرات کے پیچھے کوئی زور نہ ہو، ان سے بھی کبھی ایسے مسئلے حل ہوئے ہیں؟ جب آپ خود کو پہلے ہی نیچے گرا دیں، تو پھر معنی خیز مذاکرات کیسے؟ صرف ایک پردہ، تاکہ کوئی یہ نہ کہے کہ اپنی جان بچانے کو کشمیر سے جان چھڑائی۔ ہندوستان تو کبھی اس موقف سے بھی نہیں ہٹا کہ ''کشمیر ہمارا اٹوٹ انگ ہے'' ہم کیا مذاکرات کرنے چلے ہیں۔

کشمیر کے سلسلے میں ہمیشہ پاکستان کی یہی پالیسی رہی تھی کہ مذاکرات کے کسی بھی پہلو پر بات نہیں بڑھے گی، خاص کر تجارتی معاملات میں ہندوستان کو کوئی چھوٹ نہیں دی جائے گی۔ امریکہ اور برطانیہ کا ہم پر دباؤ رہتا کہ آپ تجارت شروع ہونے دیں، پھر جب ماحول سازگار ہو جائے گا تو کشمیر پر بھی بات ہو سکے گی۔ اس بات میں کسی قسم کی منطق نہیں تھی۔ یہ صرف کشمیر پر اپنے موقف سے منہ موڑنے کی پردہ پوشی تھی، کشمیر کو ہندوستان کا حصہ ماننے کی راہ پر پہلا قدم۔ ہندوستان کی دوستی کے عوض کشمیر کی قربانی۔ حالانکہ سب جانتے تھے کہ اس کے اثرات کیا ہوں گے، سب جانتے تھے کہ ایسا کرنے سے پاکستان کا کتنا خسارا ہوگا۔ لیکن حکومتیں فوری فوائد کی خاطر دوررس نتیجوں کی پرواہ نہیں کرتیں۔ سیاسی مفاد ہمیشہ ناعاقبت اندیش ہوتے ہیں۔

جب ہندوستان کے مقاصد پورے ہوئے تو انہوں نے اپنی فوجیں واپس لے جانی شروع کر دیں۔ 23 مئی 2002ء کو کور کمانڈر کانفرنس میں جنرل مشرف نے ہمیشہ کی طرح اپنی جیت کا اعلان کیا۔ کہنے لگے کولن پاول نے بتایا ہے کہ ہندوستان فوجوں کی واپسی چاہتا ہے۔ انہوں نے اس سلسلے میں اپنی برتری اور فوقیت ظاہر کرنے کیلئے کہا ''جو ہم کشمیر میں کر رہے تھے، ساری دنیا جانتی تھی۔ اب ہم مجاہدین کو ہمیشہ کیلئے تو روک نہیں سکتے۔ یہ پالیسی اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک ہندوستان مذاکرات شروع نہ کرے، آبادیوں سے اپنی افواج نہ ہٹائے اور میڈیا اور انسانی حقوق کی تنظیموں کو کشمیر میں جانے کی اجازت نہ دے۔ اگر جنگ ہوئی تو ایسے حالات پیدا ہو جائیں گے کہ ان پر نہ میں قابو پا سکوں گا اور نہ ہی دنیا۔ ہزاروں لوگ پاکستان سے اٹھ کر کشمیر میں داخل ہو جائیں گے''۔ مجھے ایسے لگا جیسے 1971ء کی لڑائی میں مشرقی پاکستان میں ہتھیار ڈالنے کے بعد جنرل یحییٰ نے قوم سے گرج دار خطاب کیا تھا، کہ ہماری جنگ جاری ہے۔ پھر اسی طرح جنرل مشرف نے اپنی جیت کے جشن کے طور پر کہا، ''کل ہم پہلا غوری میزائل فائر کریں گے''۔ (جاری ہے)

☆☆☆☆☆

قسط نمبر 13

مُشرّف کی اسرائیل سے سفارتی تعلقات کی تجویز افسران نے مُسترد کردی تھی

امریکہ سے واپسی پر کہنے لگے "ہم خوامخواہ فلسطین کی خاطر عربوں سے بھی سبقت لے جانا چاہتے ہیں- اسرائیل سے تعلقات میں بہت فائدہ ہے-تم لوگ بات کی گہرائی کو نہیں سمجھتے"-عراق میں سپاہ بھیجنے کی تجویز بھی کور کمانڈرز نے نہیں مانی- لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کی کتاب سے اقتباسات

لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کا شمار افواج پاکستان کے مایہ ناز، بلند ہمت، باکردار اور اصول پسند افسران میں ہوتا ہے۔ انہیں جس قدر کامیابیاں حاصل ہوئیں، اس کی وجہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر مکمل یقین ہے۔ جہاں کہیں بھی وطن عزیز کے دفاع اور قومی مفادات کا معاملہ سامنے آیا، وہ حکمرانوں کے سامنے بڑی جرأت اور استقامت سے حاضر سروس جنرل ہوتے ہوئے بھی اختلافی رائے پیش کرتے رہے۔ ڈائریکٹر جنرل تجزیاتی ونگ کی حیثیت سے کارگل کے محاذ کے حوالے سے انہوں نے ہمیشہ حقیقت پسندانہ تجزیہ اعلیٰ فوجی حکام کو مہیا کیا۔ نائن الیون ((9/11 کے بعد امریکہ کیلئے فوجی سہولتوں کی فراہمی کے معاملے پر بھی اعلیٰ سطحی فوجی اجلاس میں کھل کر کلمہ حق بلند کیا۔ ان کی ملازمت کا عرصہ فیض کے اس مصرعے کی عملی تفسیر رہا:

جو رکے تو کوہِ گراں تھے ہم، جو چلے تو جاں سے گزر گئے

لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کی اجازت سے، ان کی کتاب "یہ خاموشی کہاں تک" سے منتخب اقتباسات قارئین کی معلومات اور دلچسپی کے لیے پیش کیے جا رہے ہیں۔

دسمبر 2001ء کے آخری ایام میں ہم نے کوہاٹ کی جیل خالی کرا کر اس میں غیر ملکی اور اس لڑائی سے منسلک پاکستانی قیدی رکھ دیئے۔ 80 عرب شہری اور پکڑے گئے تھے اور بتایا گیا تھا کہ یہ امریکہ کو نہیں دیئے جائیں گے۔ یہ خبر بھی ISI سے ملی کہ جو پاکستانی یہاں سے جہاد کے لیے افغانستان گئے تھے، ان میں سے 110 کابل سے جہاز میں بٹھا کر ہندوستان لے جائے گئے ہیں۔ اس کے بعد ان کی کوئی خبر نہیں ملی۔ پھر جنرل ٹومی فرینکس سے پیغام ملا کہ 892 پاکستانی کابل جیل میں ہیں، جنہیں واپس پاکستان بھیجا جائے گا اور جو 232 غیر ملکی قیدی پاکستان میں ہیں، امریکہ کی سینٹرل کمانڈ (CENTCOM) کے لوگ انہیں قندھار لے جائیں گے۔ کچھ دنوں بعد PAF کے جہاز 1100 پاکستانی قیدی لے کر افغانستان سے آئے۔ انہیں ہری پور جیل بھجوا دیا گیا۔ یہ تمام کام ISI کی زیر نگرانی ہوتے تھے، ہمیں صرف خبر ملتی تھی۔ فوج جو بھی مجاہدین پکڑتی تفتیش کے لیے ISI کے حوالے کر دیتی۔ پھر وہ کہاں جاتے فوج کو خبر نہ ہوتی۔

21 اگست 2002ء کو جنرل ڈین میکنیل (General Dan McNeill, US Army) سے جنرل یوسف کے دفتر میں ملاقات ہوئی۔ یہ اُن دنوں افغانستان میں کولیشن فورسس کمانڈ (Commander Coalition Forces, Afghanistan) تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ امریکہ نے ہمیں دونوں طرف سے گھیرا ہوا ہے۔ ایک طرف تو آپ کی فوج نے القاعدہ کو پاکستان میں آنے کا موقع فراہم کیا، ہم کو اپنی کارروائیوں کی کوئی خبر نہ لگنے دی، دوسری طرف سے آپ کے ساتھی ہندوستان نے ہمیں مشرق کی طرف کھینچنا شروع کیا۔ ان باتوں سے ہمارے بیچ بے اعتباری پیدا ہوئی۔ پاکستان کے تعاون کے بغیر تو آپ کامیاب نہیں ہو سکتے۔ افغانستان میں جو ہندوستان کو منظم کرنے کی کوشش ہو رہی ہے، ہمارے لیے دہرا خطرہ پیدا کیا جا رہا ہے۔ میں نے یہ بھی کہا کہ ایسی توقع نہ رکھیں کہ اسی دباؤ میں آ کر ہم کشمیر کو بھی بھلا دیں گے۔ سخت طبیعت کے انسان دکھائی دیتے تھے، مگر ہنس کر میری باتوں کے گول مول جواب دے دیئے۔

اسی دن براستہ MO، چیف صاحب کا حکم بھی موصول ہوا کہ ہماری فوج کے کچھ افسران افغانستان میں بگرام کے امریکی ہیڈ کوارٹر میں تعینات ہوں گے، تاکہ ان سے بہتر ہم آہنگی رہے۔ پھر ایک سال کے اندر اندر ہماری فوج کا ایک نمائندہ CENTCOM ہیڈ کوارٹر ٹامپا، فلوریڈا (Tampa, Florida) میں بھی بھیج دیا گیا۔ SSG میں تیز ردعمل کرنے والی ٹیمیں (Quick Reaction Force-QRF) تشکیل دی گئیں، جن کی تربیت امریکی تربیلا کے علاقے میں کرتے۔ SSG کی ایک اسپیشل آپریشنز ٹاسک فورس (Special Operations Task Force-SOTF) فاٹا میں کارروائیوں کے لیے قائم کی گئی۔ ان کے لیے فراہم کیا ہوا ساز و سامان بھی تربیلا میں ہی رکھا گیا اور یہیں SOTF کے لیے ہیلی کاپٹروں کے پائلٹوں کی رات میں کارروائی کی تربیت بھی دی جاتی۔ کافی امریکی یہاں پر مقیم ہو گئے۔ پھر سپاہیوں کے چالیس چالیس کے گروپ تربیت کے لیے امریکہ جانے شروع ہوئے۔ تربیت کیا تھی، امریکہ کی سوچوں پر ڈھالنا تھا، ان کی محبت پیدا کرنی تھی۔

SOTF پشاور کی کور کے احکام پر کام کرتی تھی، لیکن امریکہ سے زیادہ تعاون ISI کا رہتا اور ان دونوں فوج اور ISI میں FATA کے سلسلے میں خاصا کھنچاؤ رہنے لگا۔ کئی مرتبہ چیف کی موجودگی میں تنازعہ اٹھ چکا تھا۔ پھر چیف نے زور دینا شروع کر دیا کہ SOTF کو ISI کے ہی نیچے کر دیا جائے اور وہ ہی امریکہ سے ملاپ رکھتے ہوئے اس کی کارروائیوں کو کنٹرول کرے۔ شاید ان کا خیال تھا کہ فوج دل سے اس کام پر مائل نہیں۔ اس پر کافی لے دے ہوئی، مگر فوج آمادہ نہ ہوئی، نہ وائس چیف، نہ کور کمانڈر اور نہ ہی میں۔ فوج کے ایک سیغہ کی کمانڈ ISI کو کیسے دے دیتے، ISI میں فوجی تو ضرور تھے مگر وہ فوج کا حصہ تو نہیں تھی۔ تنازعہ چلتا رہا۔ فوج کی کارکردگی کی شکایات چیف کو جاتی رہیں۔ امریکہ سے کچھ نہ کچھ فوجی ساز و سامان بھی ملتا رہا، جس میں سامان کم اور ساز زیادہ ہوتا۔ سامان کسی اہم نوعیت کا نہیں تھا اور زیادہ وعدے ہی رہتے۔ سامان کہیں پائپ لائن (pipe line) میں ہی پھنسا رہتا۔ جنرل یوسف ہر درجے پر ملاقات میں اُن سے شکوہ کرتے۔

جنرل مشرف امریکہ کے ایک دورے پر گئے، جہاں یہودیوں نے اُن کی خوب آؤ بھگت کی۔ یہ سلسلے اخباروں اور ٹی وی پر سب ہی نے دیکھے۔ واپس آئے تو GHQ تشریف لائے اور کہنے لگے "ہمیں اسرائیل سے سفارتی تعلقات قائم کر لینے چاہئیں۔ ترکی کے بھی تعلقات ہیں اور کئی عرب ممالک کے بھی، آخر ہم ہی کیوں اپنا نقصان کر رہے ہیں، ہم خوامخواہ فلسطین کی خاطر عربوں سے بھی سبقت لے جانا چاہتے ہیں"۔ کسی نے بھی اس تجویز سے اتفاق نہ کیا۔ کچھ دیر بحث و مباحثے کے بعد ناراض ہو کر چلے گئے۔ کہنے لگے کہ اس میں ہمارا بہت فائدہ ہے، تم لوگ بات کی گہرائی کو نہیں سمجھتے۔

پھر اگلی دفعہ آئے تو کہا کہ امریکہ ہم سے عراق میں فوجی امداد چاہتا ہے۔ اس کی بھی سب نے مخالفت کی کہ ہمیں مسلمانوں کے خلاف اپنی سپاہ نہیں استعمال کرنی چاہئے، تو کہنے لگے کہ ہم عوام کی امداد میں سپاہ بھیجیں گے، صرف کچھ ڈاکٹر اور تعمیر نو کے لیے انجینئرز کی سپاہ۔ سب سمجھتے تھے کہ یہ صرف ایک بہانہ ہے، اصل مقصد لڑاکا سپاہ بھیجنا ہی ہے۔ میں نے کہا کہ ابھی تو ہماری سپاہ FATA میں بھی چاہئے اور ہندوستان کے بارڈر پر اب بھی کچھ فوج لگی ہے۔ ہمارے پاس سپاہ کی بہت قلت ہے۔ کافی ناراض ہوئے مگر اپنی بات سے نہ ہٹے۔

یہ مسئلہ کافی عرصے تک چلتا رہا۔ پھر مئی 2003ء میں کور کمانڈرز کی کانفرنس میں بھی یہ بات اٹھائی گئی، لیکن کور کمانڈر اس پر آمادہ نہ تھے۔ کچھ نے اعتراض کیا، زیادہ خاموش رہے، مگر کسی نے بھی ان کا ساتھ نہ دیا۔ کہنے لگے دیکھتے ہیں کہ اس میں خرچ کا کیا بندوبست ہوگا اور یہ کہ آیا اور مسلم ممالک بھی سپاہ بھیجتے ہیں یا نہیں۔ اگر نہیں تو کم از کم UN یا OIC کی چھتری کی آڑ ملنی چاہئے۔ یہ اس لیے لازم تھا کہ زیادہ اعتراضات نہ ہوں۔ مئی کے آخری ہفتے میں عراق پر اقوام متحدہ کی قرارداد بھی آ گئی اور کہا گیا کہ DGMO CENTCOM ہیڈ کوارٹر، قطر جائیں تاکہ عراق فوج بھیجنے کے سلسلے میں معاملات طے کر لیں۔ جون میں امریکی ٹیم بھی اس سلسلے میں آئی اور پہلے بتایا گیا کہ ایک ڈویژن بھیجا جائے گا، پھر حکم ملا کہ ڈویژن ہیڈ کوارٹر اور دو پیادہ فوج کے بریگیڈ ستمبر کے مہینے میں بھیجیں گے، تیاری کر لیں۔ نہ جانے وہ ڈاکٹروں اور انجینئروں کو بھیجنے کی کہانی کہاں رہ گئی تھی۔ اگست میں کور کمانڈر کانفرنس میں جنرل مشرف نے پھر کہا کہ سپاہ شاید عراق بھیجی جائیں، ابھی حتمی فیصلہ نہیں کیا ہے۔ کچھ عرصے بعد پتا چلا کہ یہ معاملہ ختم ہو چکا ہے اور سپاہ عراق نہیں جائیں گی۔ شاید فوج کے علاوہ اور بھی جگہوں سے مخالفت تھی۔

جون 2002ء میں بلوچستان سے متعلق ISI سے ایک رپورٹ ملی کہ خیر بخش مری کو ہندوستان کی خفیہ ایجنسی RAW (Research and Analysis Wing) پیسے دے رہی ہے۔ بگٹی صاحب نے پہلے ہی خاصے مسائل پیدا کر رکھے تھے اور گیس کی کھوج شروع نہیں کرنے دیتے تھے۔ اس رپورٹ میں اس سلسلے کی بھی تفصیلات تھیں۔ پھر دو دن بعد بتایا گیا کہ خیر بخش مری نے اپنے قبیلے کے 200 لوگ بگٹی صاحب کی حفاظت کے لیے فراہم کیے ہیں۔ بگٹی صاحب کے ساتھ یہ مسائل چلتے رہے۔ ہمیں خبریں ملتی رہتیں کہ بلوچستان سے کچھ اور اہم لوگ بھی افغانستان جاتے اور وہاں سے انہیں امریکہ کی طرف سے پیسے دیئے جاتے۔ جنرل مشرف کی حکومت نے بلوچستان کے سلسلے میں کئی اچھے اقدامات بھی لیے، مگر عمومی طور پر معاملہ سلجھا نہیں۔ (جاری ہے)

☆☆☆☆☆
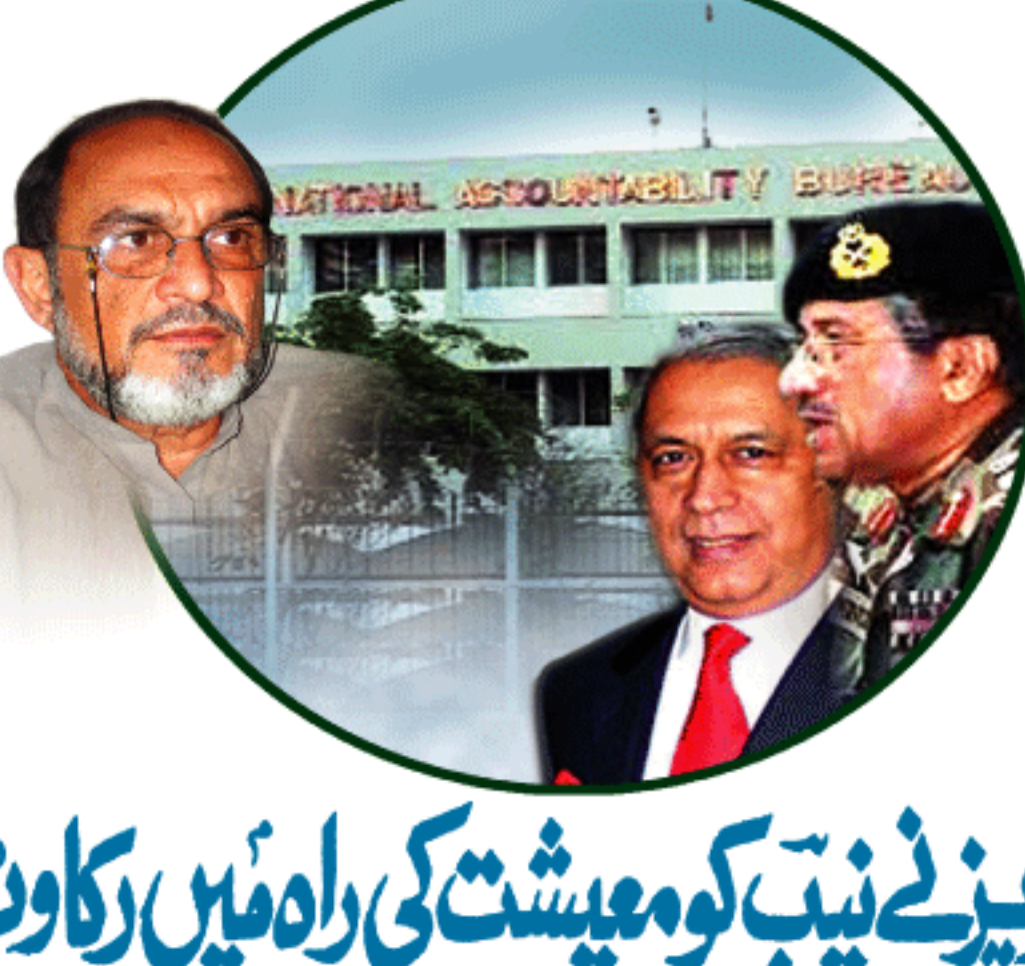
”شوکت عزیز نے نیب کو معیشت کی راہ میں رکاوٹ قرار دیا“

کہتے تھے نیب کی کارروائیوں سے ملک دیوالیہ ہوجائیگا - نیب سربراہ جنرل امجد کو ہٹانے پر مشرف نے بھی سکھ کا سانس لیا - سول بیوروکریسی کے دباؤ پر مشرف نے کور کمانڈرز کی تجاویز کو بھی نظر انداز کرنا شروع کردیا تھا - لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کی کتاب سے اقتباس
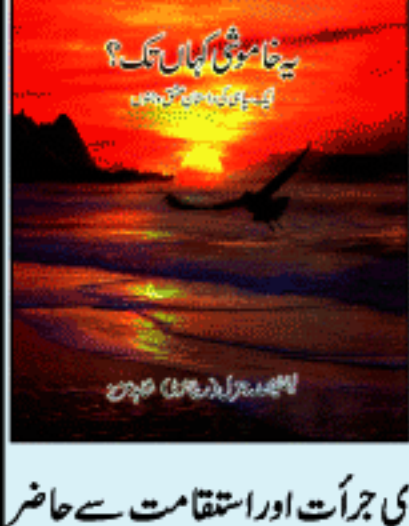
لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کا شمار افواج پاکستان کے مایہ ناز، بلند ہمت، باکردار اور اصول پسند افسران میں ہوتا ہے۔ انہیں جس قدر کامیابیاں حاصل ہوئیں، اس کی وجہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر مکمل یقین ہے۔ جہاں کہیں بھی وطن عزیز کے دفاع اور قومی مفادات کا معاملہ سامنے آیا، وہ حکمرانوں کے سامنے بڑی جرأت اور استقامت سے حاضر سروس جنرل ہوتے ہوئے بھی اختلافی رائے پیش کرتے رہے۔ ڈائریکٹر جنرل تجزیاتی ونگ کی حیثیت سے کارگل کے محاذ کے حوالے سے انہوں نے ہمیشہ حقیقت پسندانہ تجزیہ اعلیٰ فوجی حکام کو مہیا کیا۔ نائن الیون (9/11) کے بعد امریکہ کیلئے فوجی سہولتوں کی فراہمی کے معاملے پر بھی اعلیٰ سطحی فوجی اجلاس میں کھل کر کلمہ حق بلند کیا۔ ان کی ملازمت کا عرصہ فیض کے اس مصرعے کی عملی تفسیر رہا:

جو رکے تو کوہِ گراں تھے ہم، جو چلے تو جاں سے گزر گئے

لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کی اجازت سے، ان کی کتاب ”یہ خاموشی کہاں تک“ سے منتخب اقتباسات قارئین کی معلومات اور دلچسپی کے لیے پیش کیے جارہے ہیں۔

فوجی حکومت کے شروع کے سال عام طور پر اچھے سمجھے جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ جب تک فوجی سربراہ کو سیاسی حکومت کا بوجھ نہیں اٹھانا پڑا، حکومت اچھی چلتی رہی۔ خرابی کی ذمہ داری سیاستدانوں پر ہی رہی۔ میں نے DGMO کے طور پر اور جب سیاسی حکومت آگئی تو CGS کے طور پر، دونوں دور میں قریب سے حکومت کو کام کرتے دیکھا ہے۔ پورے ملک میں حکومتی ڈھانچے کی مانیٹرنگ بھی کی۔ پھر NAB میں رہتے ہوئے بھی بہت سی باتیں مجھ پر کھلیں۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ اصل میں اونٹ پہلے سال ہی ایک کروٹ بیٹھ چکا تھا۔ دیکھنے والوں کو نظر آتا تھا۔

بہت سے اچھے اقدامات جنرل مشرف نے شروع کیے اور اس وقت ہمارا یہ تاثر تھا کہ بہت خلوص کے ساتھ آغاز کیا۔ پھر جیسے جیسے حکومت کی پیچیدگیوں میں الجھتے گئے، ان کاموں پر ان کی گرفت کمزور پڑتی گئی، جنہیں ہم سب اہم سمجھتے تھے۔ یقیناً پیسے کی قلت بھی تھی، لیکن ایسی بھی نہیں کہ ان تبدیلیوں کے لیے رکاوٹ بنتی۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان کی ترجیحات بدلتی گئیں اور ابتدائی اہداف سکڑتے رہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کی بنیادی وجہ ہماری سول سروس تھی۔ یہی اس جمود کی جڑ تھی۔ چنے ہوئے منسٹروں کی ٹیم کے باوجود انہوں نے کسی چیز کو بدلنے نہیں دیا اور نہ ہی یہ کسی طور پر اپنی کارکردگی ظاہر کرنے پر رضامند تھے۔ ہر چیز کو خفیہ رکھنا چاہتے، ہر بات کی پردہ پوشی ہوتی۔ ایک دوسرے کو آڑ مہیا کرتے۔ ملک یہی چلاتے ہیں اور اپنے اس کاروباری نظام کو تحفظ دینا ان کی پہلی ترجیح تھی۔ پھر سیاستدان آگئے۔ یہ بھی صرف ذاتی مفاد پر ہی مرکوز رہے۔ اب خرابی اور بڑھ گئی کہ اب منسٹر بھی نااہل آگئے اور سول سروس کے مزید مرہون منت ٹھہرے۔ یہ کارکردگی کی بنیاد پر تو آتے نہیں، صرف ووٹ کی بنیاد پر آتے ہیں اور اس ہی کی فکر میں رہتے ہیں۔ اپنی شخصی حیثیت کے مطابق منسٹری پاتے ہیں۔ سیاست کا سارا کھیل اس ہی ایک اقدار پر چلتا ہے۔ جس کی کوئی ضرر رسانی کی صلاحیت نہیں، اسے استعمال کے بعد پھینک دیا جاتا ہے۔

شروع کے ہی دنوں میں جنرل صاحب نے حکم دیا کہ حکومت کو شفاف بنانے (transparency) کے لیے تمام حکومت کے دفاتر اپنی ویب سائٹ (website) کھولیں گے اور روزمرہ کے فیصلے اور کارروائیاں اس پر ظاہر کریں گے۔ حکومت کے کسی دفتر نے اس پر عمل نہیں کیا۔ مانیٹرنگ نظام کے بہت اصرار پر چند نے ویب سائٹس کھولیں، مگر صرف دکھاوے کے طور پر اپنی کچھ معلوماتی چیزیں ظاہر کردیں، اس سے آگے نہ بڑھے۔ سب نے کہا کہ ہمارے پاس نہ ہی اس کام کے لیے پیسے ہیں اور نہ ہی صلاحیت۔ حالت جوں کی توں رہی۔ شروع کے دنوں میں جنرل مشرف نے اپنے اثاثے ظاہر کیے اور احکامات دیئے کہ تمام سول سرونٹس بھی ایک دیئے ہوئے فارم پر اپنے اثاثے ظاہر کریں۔ فارم بھی تیار کرلیے گئے۔ کور کمانڈر کانفرنس میں اس بات پر خاصا زور بھی دیا گیا۔ اس خبر سے پوری سول سروس میں ایک کھلبلی مچ گئی۔ کہا گیا کہ سول سروس میں اس بے اعتمادی پر بہت بے چینی ہے اور اگر اس بات پر زور دیا گیا تو خطرہ ہے کہ قلم بند (pens down) ہڑتال ہوسکتی ہے۔ جنرل مشرف پیچھے ہٹ گئے۔ آخر حکومت بھی چلانی تھی۔

مانیٹرنگ کا نظام، جو بڑے زور و شور سے شروع ہوا تھا، جلد ہی لڑکھڑانے لگا۔ لپیٹ لیا گیا۔ آہستہ آہستہ اس کے خلاف شکایات بڑھتی جارہی تھیں۔ میں جنرل مشرف کی خفگیاں سہتا رہا، مگر اسے بچا نہ سکا۔ جب حکومت کو آنکھیں درکار نہیں تو ہم اپنی آنکھیں کب تک پھوڑتے؟ سول سرونٹس نے کہا کہ ہمارے کام میں اتنی مداخلت ہے کہ ہم کام ہی نہیں کرسکتے، فوج کے سوالوں کے جواب دیتے رہیں یا اپنا کام کریں؟ مانیٹرنگ کے نظام میں کوئی فوجی کسی قسم کے احکام دینے کا مجاز نہیں تھا۔ احکامات صرف حکومتی نظام کے ذریعے ہی دیئے جاسکتے تھے۔ پھر بھی یہ بوجھ دکھائی دیا۔ کہا گیا کہ فوجی افسران اپنے ذاتی کام زیادہ کرواتے ہیں اور سرکاری کاموں پر کم توجہ دیتے ہیں۔ یقیناً کہیں ایسا بھی ہوا ہوگا، مگر اسے کافی حد تک روکا جاسکتا تھا، فوج کو قابو کرنا مشکل نہیں۔ شکایت کی وجہ یہ نہیں تھی۔ ہمارے حکومتی طور طریقوں کو میں نے بہت غور سے دیکھا ہے اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ بالکل غلط تاثر تھا۔ میں نے سرکاری ملازمین میں ایک سے ایک عمدہ انسان بھی دیکھے ہیں، مگر عام طور پر، سرکاری ملازمین، بالا افسران کے ذاتی کام ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالتے ہیں اور انہیں پورا کرنے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے میں لگے رہتے ہیں۔ انہیں اور چاہئے ہی کیا کہ ان کا بالا افسران کا شکرگزار رہے۔ جب ان کے اوپر والا ان سے خوش ہے تو پھر انہیں کون پوچھے گا؟ ان کی تو آرزو رہتی ہے کہ بڑے صاحب کو ”کانا“ کردیں۔ جستجو صرف اتنی تھی کہ ہمارے کام پر کسی کی نظر نہ ہو۔ کوئی پوچھنے والا نہ ہو۔ جو مشاورتی کونسل چیف ایگزیکٹو کی امداد کے لیے بنائی گئی تھی، گھر بھیج دی گئی۔ وزارتوں کی تجاویز سول سرونٹس کی بنائی ہوئی ہوتیں اور جب چیف ایگزیکٹو ان کے برخلاف مشاورتی کونسل مشورہ دیتی تو پیچیدگیاں پیدا ہوتیں۔ اسے ختم کرنا ہی مناسب سمجھا گیا، حالانکہ وہ صرف اجتماعی دانش (collective wisdom) تھی، ایک اچھا مشورہ ملتا تھا۔ سربراہ کا دماغ اس حکمت سے محروم ہوکر، پورے طور پر سول سروس کے تابع ہوا۔ نمبروں کو یاد رکھنے کی اچھی صلاحیت تھی، حکمران نے اسی جھلکتی دانائی پر اکتفا کیا۔ کرپشن کے خاتمے کے لیے نیشنل اکاؤنٹیبلٹی بیورو (NAB) کھڑا کیا گیا اور ایک سخت قانون بنا، جو نہایت مؤثر تھا۔ شروع میں (NAB) کی کارروائی تیز تھی، لوٹے ہوئے اربوں روپے واپس آئے۔ پھر کچھ ہی عرصے میں شوکت عزیز صاحب کا محکمہ پریشان ہونے لگا۔ کہنے لگے سارا پیسہ ملک سے باہر جارہا ہے، اگر NAB کو نہ روکا گیا تو ملک دیوالیہ ہوجائے گا۔ پیسے والوں سے یہ پوچھنا چھوڑیں کہ اتنی دولت کہاں سے کمائی۔ سول سروس کا بھی لگاتار دباؤ رہا کہ سرکاری ملازمین NAB کی وجہ سے خوف و ہراس کا شکار ہیں، کسی کی بھی عزت کو تحفظ نہیں۔ اس خوف سے لوگ فیصلے کرنے سے گھبراتے ہیں اور یوں حکومت کا کاروبار نہیں چل سکتا۔ حکومت کا کام رک جائے گا اور معیشت ڈوب جائے گی۔ جس کی وجہ سے عوام ہی خسارے میں رہیں گے، غریب کا بہت نقصان ہوگا۔ NAB کے سربراہ جنرل امجد کو ہٹا دیا گیا۔ سب نے سکھ کا سانس لیا۔ جنرل مشرف نے بھی۔ جو سول سروس کی اصلاحات تھیں، کچھ عرصہ اِدھر اُدھر لڑھکتی رہیں، پھر دم توڑ گئیں۔ ڈسٹرکٹ مینجمنٹ گروپ (DMG) نے کہا آپ نے ہماری کمر ہی توڑ دی۔ بے معنی سی چند تبدیلیاں ہوئیں اور کچھ نہیں۔ نیا پولیس آرڈیننس تیار کیا گیا، مگر پولیس کی کارکردگی میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ کہا گیا کہ اس کارکردگی کو بہتر بنانے کے لیے پیسہ درکار ہے جو ہمارے پاس نہیں ہے۔ یہ نہیں کہا کہ ہم نے ان سے بہت سے غلط کام کروانے ہوتے ہیں، پھر جب یہ ہمارے ناجائز کام کرتے ہیں تو انہیں اپنے لیے غلط کام کرنے سے کوئی کیسے روکے؟

عدالتوں میں انصاف مہیا کرنے کے لیے جنرل مشرف نے یہی کہا کہ ابھی پیسے نہیں ہیں، پہلے پیسے بنالیں پھر یہ سب ٹھیک ہوسکتا ہے۔ کیسے کہتے کہ عدالتوں نے اگر انصاف شروع کردیا تو حکومت کیسے چلے گی؟ ایک مرتبہ فوج نے بہت زور دے کر جسٹس فلک شیر صاحب کو لاہور کا چیف جسٹس لگوا دیا۔ ان کا نام لوگ بہت عزت سے لیتے تھے۔ کچھ ہی دنوں میں یہ شکایت آئی کہ یہ کیسے لگوا دیا، یہ تو کسی کی سنتا ہی نہیں۔ پھر موقع پاتے ہی انہیں سپریم کورٹ منتقل کردیا گیا۔ کتنی مشکل سے ایسا ڈھونڈا تھا جو سنتا نہیں تھا، لیکن حکومت کے گلے میں پھنسنے لگا۔

اب سات نکاتی ایجنڈا سکڑنے لگا اور توجہ صرف مالیاتی حیثیت بہتر کرنے پر مرکوز کردی گئی۔ باقی کچھ ہو جو نہیں رہا تھا اور پھر کامیابی بھی تو دکھانی تھی۔ مگر جب امریکی حمایت کے عوض ملک میں غیر ملکی پیسہ آ بھی گیا تو کیا ٹھیک ہوا؟ ایک مرتبہ کور کمانڈر کانفرنس میں نکتہ چینی کی گئی کہ تمام معاشی ترجیحات ایسی ہیں کہ پیسے والا ہی امیر سے امیر تر ہوتا جارہا ہے۔ غربت پر ہماری پالیسیوں کا کچھ اثر نظر نہیں آتا۔ جنرل مشرف نے شوکت عزیز صاحب کا فلسفہ دہرایا کہ جب اوپر کی سطح پر پیسہ آئے گا تو آہستہ آہستہ trickle نیچے پہنچیں گے، یہی معیشت کا اصول ہے، اس میں ذرا وقت لگتا ہے۔ صبر کرنا ہوگا۔ نیچے والے بیچارے آج تک صبر ہی کررہے ہیں۔

پھر وزارت خزانہ سے ایک تجویز آئی کہ ٹیکس دینے والوں کی تعداد بڑھائی جائے (broadening the tax base)۔ اس سلسلے میں فوج کو کہا گیا کہ CBR (آج کا FBR) کی امداد میں تجارتی طبقے سے نئے ٹیکس فارم بھروائے جائیں۔ میں نے کہا کہ فوج کی بندوقوں کے زور پر دکانداروں کے اوپر ایک کرپٹ محکمے کو حملہ آور نہ کرایا جائے۔ اگر عوام پر یوں بوجھ ڈالنا ہی ہے تو پہلے اس محکمے کی کچھ صفائی کرلیں۔ پھر اس میں سے چند لوگوں کی لسٹ تیار ہوئی کہ یہ کچھ زیادہ ہی خراب ہیں۔ چیئرمین CBR نے کہا کہ اگر آپ صرف صاف لوگ ہی چاہتے ہیں تو CBR میں میرے پاس ایک بھی آدمی ایسا نہیں جو ”للی وائٹ“ ہو۔ جو ہیں ان ہی سے کام چلائیں۔ پھر دکان دکان پھر کر رسوا ہوئے۔ دکانداروں نے ہڑتالیں شروع کردیں اور کچھ دن خوب ہنگامہ ہوا۔ آخر حکومت پیچھے ہٹ گئی اور دکانداروں سے مذاکرات کرکے ٹیکس فارم پھاڑ ڈالا، اپنے ٹیکس کے اہداف ہی تبدیل کرلیے۔ پھر کہا کامیابی ہوئی۔ (جاری ہے)

☆☆☆☆☆

”مشرف نے جان بوجھ کر کمزور سیاسی قیادت کا انتخاب کیا“

تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتے تھے-فوج کی سخت مخالفت کے باوجود چوہدری برادران کو حکومت میں شامل کیا گیا-نیشنل سیکورٹی کونسل کا حکومت میں کوئی کردار نہیں تھا-لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کی کتاب سے اقتباسات
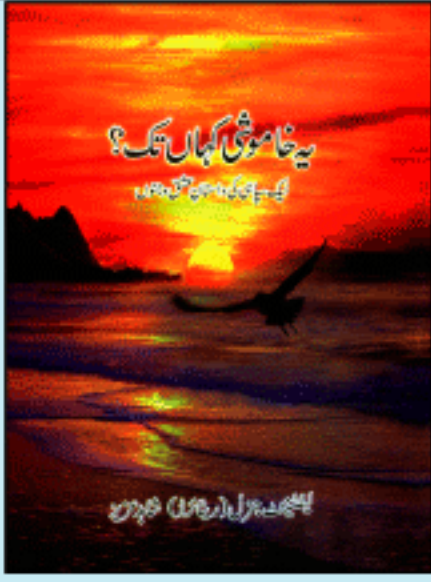
سپریم کورٹ نے جنرل مشرف کو تین سال کا عرصہ دیا تھا کہ الیکشن کرا کے حکومت، عوام کے نمائندوں کو 2002ء تک سونپ دی جائے۔ جنرل مشرف کو کچھ کور کمانڈرز نے کانفرنس میں کہا کہ آپ خود سیاست میں نہ الجھیں، گندے ہوں گے۔ آپ صاف ستھرے لوگوں کو الیکشن میں حصہ لینے کی اجازت دیں اور خود کو اس سے اوپر رکھیں۔ اگر حکومت صحیح کام نہیں کرتی تو سیاسی نظام اسے بدل دے گا۔ کہنے لگے کہ جو سیاسی پنڈت ہیں، ان کا کہنا ہے کہ سیاست سے باہر رہو گے تو کوئی چیز قابو میں نہ رہے گی۔ اگر حکومت کرنی ہے تو سیاست کے میدان میں اترنا ہی پڑے گا اور یہ کھیل ہے ہی گندا تو پھر گندا ہونا پڑے گا۔

ناکارہ اور کمزور سیاسی قیادت کے چناؤ کی بھی یہی وجہ تھی کہ طاقت کا سرچشمہ فوجی ٹوپی کے نیچے ہی رہے۔ اس کے لیے تابعدار سول سروس، طارق عزیز صاحب کی سربراہی میں حاضر تھی۔ جنرل مشرف کی نئی ٹیم۔ بندوق کی نوک پر جاگیردارانہ، موروثی سیاسی نظام ختم کر کے نیا سیاسی نظام لانا تھا، جو لوگوں کی امنگوں کا آئینہ دار ہوتا۔ یہی حکمران کا شروع سے منصوبہ تھا اور یہی وعدہ۔ شروع کے دنوں میں فوج کا بھی اس سلسلے پر خاصا زور تھا۔ کوئی کہتا صدارتی نظام لگا دیں، ہمارے ملک کے لیے یہی موزوں ہے۔ کوئی کہتا یہی نظام ٹھیک ہے، بس الیکٹورل نظام کو مضبوط کریں، تاکہ اچھے لوگ ابھر سکیں۔ اس بحث کو ختم کرتے ہوئے ایک مرتبہ جنرل صاحب کہنے لگے کہ میں چین گیا تھا، وہاں اپنے چینی بھائیوں سے بھی مشورہ کیا۔ ان کی بات میں بہت گہرائی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ نظام جو بھی ہو، کوئی فرق نہیں پڑتا، اہم چیز یہ ہے کہ جو بھی نظام ہو اس کی ملک پر گرفت صحیح ہونی چاہیے۔ مسکرائے۔ کچھ دیر خاموش رہے۔ سوچا ہوگا میں کمانڈو ہوں، سخت گرفت رکھتا ہوں، بس اتنا کافی ہے۔ یہ نہیں سوچا کہ چینی بھائی نے کہا تھا کہ نظام کی گرفت ہونی چاہیے، ناظم کی نہیں۔ اس نظام کی گرفت میں تو کچھ بھی نہیں تھا، سوائے کسی لاچار شخص کے اور یہ بھی نہیں سوچا کہ اگر مان بھی لیں کہ فوجی حکمران سخت گرفت سے چیزوں کو قابو کر لے گا تو پھر اس کے جانے کے بعد کیا ہوگا؟ ناظم تو بدلتے ہی رہیں گے، نظام مضبوط نہ ہوا تو ملک تو پھر بھی ڈوب ہی جائے گا۔

جنرل مشرف کو عوام کا تعاون بھی حاصل تھا، فوج بھی ساتھ کھڑی تھی اور پوری دنیا نے بھی گلے لگایا ہوا تھا، کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ اتنی طاقت کسے ملتی ہے؟ لیکن ملک کو نیا نظام دینے کی سمت کوئی کام نہ کیا گیا۔ شاید اس لیے کہ اتنا بڑا جھمیلا کون سر پر اٹھائے، شاید اس لیے بھی کہ اگر نیا مضبوط سیاسی نظام تشکیل دیا جاتا، جس میں ملک کے بہترین لوگ آگے آ سکتے اور حکومت کارگر ہوتی تو ایسا نظام خود طاقت اختیار کر لیتا۔ پھر ان سب کا کیا ہوتا؟ سیاسی ڈھانچے میں ردو بدل صرف سترہویں ترمیم تک ہی رہی۔ نظام میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔ ظاہر ہے، اب جو موجودہ نظام کے تحت منتخب ہو کر آئیں گے وہ کیسے اس نظام کو بدلیں گے، جس کے زور پر انہیں طاقت ملی۔ نظام یہی رہے گا جب تک اسے نوچ کر نہ ہٹایا جائے۔ نیشنل سیکورٹی کونسل (NSC) پر اکتفا کیا گیا اور یہ ادارہ بھی ناکارہ ہی رہا۔ اس کا حکومت میں کوئی کردار (contribution) نہیں تھا۔ بلدیاتی نظام (local government) پر جنرل نقوی کی قیادت میں خاصا کام کیا گیا، مگر نہ ہی یہ سول سروس کو بھایا اور نہ ہی سیاستدانوں نے اسے قبول کیا۔ سول سروس کی گرفت میں تختی نہ رہی جو انگریز بادشاہ عطا کر گیا تھا اور نچلی سطح پر بھی عوام کے نمائندوں کے تابع ہوئی۔ کیوں خوش ہوتی؟ سیاستدانوں کو یہ شکایت رہی کہ کیا پارلیمنٹ صرف قانون سازی ہی کرے اور سارا ترقیاتی بجٹ ناظمین کو ہی ملے؟ صوبائی حکومتوں نے کہا کہ ناظمین خود مختار ہیں، پھر ہماری کیا طاقت رہ گئی؟ جھگڑا سارا طاقت اور پیسے کا تھا، عوام کی بہتری کا نہیں۔ کچھ ردو بدل کی گئی، طاقت اور پیسے کو بانٹا گیا، لیکن پھر بھی کوئی خوش نہ تھا۔ یہ نظام بھی ناکارہ ہوا۔ جب اوپر کی سطح پر نظام میں تبدیلی نہ لائی جائے تو نیچے کوئی تبدیلی کیسے آئے؟ یہ سارا نظام ان ہی سیاستدانوں نے تشکیل دیا ہے اور اس جمود اور بدستور حالت (status quo) کو ہلانے میں ان سب کا نقصان ہے، جو اس سے مستفید ہو رہے ہیں۔ کیونکہ یہ اقتدار اور پیسے کے پجاری اس نظام میں کوئی تبدیلی لانے دیں گے۔

جنرل مشرف نے پھر کور کمانڈر کانفرنس میں یہ صفائی پیش کی کہ جہاں تک شفاف سیاستدانوں کا سوال ہے تو جتنے سیاستدان ہیں، جب تک طاقت میں نہیں آئے تھے تو سب ہی صاف تھے۔ یہ گند تو بعد میں ان سے چپکا۔ تو اگر ہم صاف لوگوں کو لے لیں تو کیا گارنٹی کہ کل جب یہ طاقت میں آتے ہیں تو گندے نہیں ہو جائیں گے؟ پھر ہم پہلی بار سیاسی نظام کو چلانے لگے ہیں، ضروری ہے کہ یہ لوگ ہمارے قابو میں رہیں۔ شفاف لوگوں کو کون قابو کرے گا؟ وعدہ کیا کہ اگلے الیکشن میں شفاف لوگوں کو ہی لاؤں گا۔ یوں چوہدری برادران کو فوج کی سخت مخالفت کے باوجود سیاسی قیادت کے لیے جگہ ملی۔ پھر جنرل مشرف کو سیاستدان بن کر، وردی پہنے، قماش قماش کی ٹوپیوں میں سب نے دیکھا۔ فوجی ٹوپیاں پہننے والے وردی کی اس بے حرمتی پر کڑھتے رہے۔ (جاری ہے)

لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کا شمار افواج پاکستان کے مایہ ناز، بلند ہمت، باکردار اور اصول پسند افسران میں ہوتا ہے۔ انہیں جس قدر کامیابیاں حاصل ہوئیں، اس کی وجہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر مکمل یقین ہے۔ جہاں کہیں بھی وطن عزیز کے دفاع اور قومی مفادات کا معاملہ سامنے آیا، وہ حکمرانوں کے سامنے بڑی جرأت اور استقامت سے حاضر سروس جنرل ہوتے ہوئے بھی اختلافی رائے پیش کرتے رہے۔ ڈائریکٹر جنرل تجزیاتی ونگ کی حیثیت سے کارگل کے محاذ کے حوالے سے انہوں نے ہمیشہ حقیقت پسندانہ تجزیہ اعلیٰ فوجی حکام کو مہیا کیا۔ نائن الیون (11/9) کے بعد امریکہ کیلئے فوجی سہولتوں کی فراہمی کے معاملے پر بھی اعلیٰ سطحی فوجی اجلاس میں کھل کر کلمہ حق بلند کیا۔ ان کی ملازمت کا عرصہ فیض کے اس مصرعے کی عملی تفسیر رہا:

جو رکے تو کوہِ گراں تھے ہم، جو چلے تو جاں سے گزر گئے

لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کی اجازت سے، ان کی کتاب ”یہ خاموشی کہاں تک“ سے منتخب اقتباسات قارئین کی معلومات اور دلچسپی کے لیے پیش کیے جا رہے ہیں۔☆

☆☆☆☆☆

اتوار 17 فروری 2013ء

روزنامہ امت کراچی/حیدر آباد

قسط نمبر 16

مرضی کے خلاف بات سُن کر مُشرف ناراض ہو جاتے تھے

کور کمانڈر کانفرنس میں سابق صدر نے کہا کہ پیپلز پارٹی کو توڑا اور مسلم لیگ ’’ن‘‘ کو کمزور کیا جائے گا - ووٹروں کی عمر 18 سال کرنے کا مقصد نوجوانوں سے زیادہ ووٹ حاصل کرنا تھا - لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کی کتاب سے اقتباسات
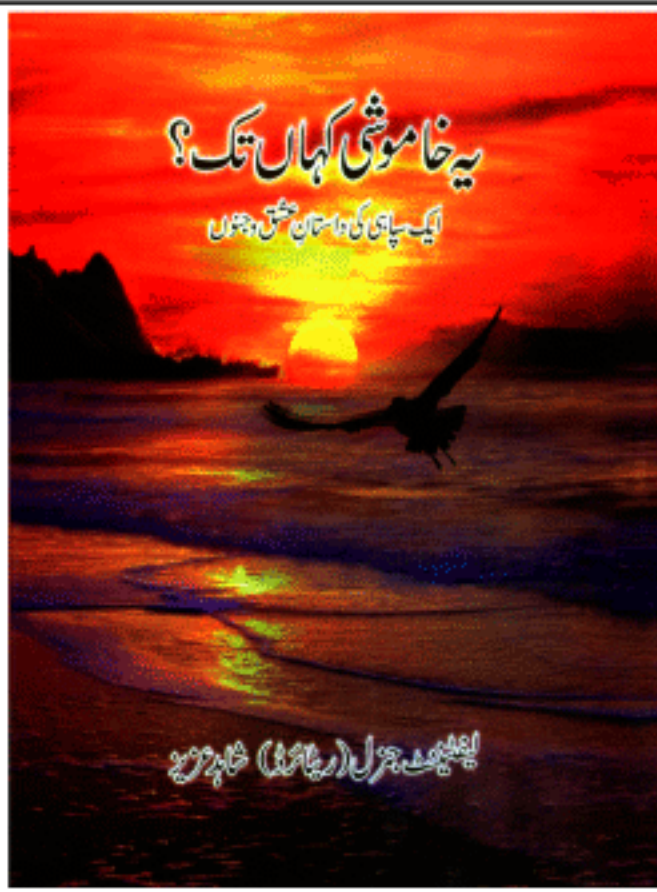
یہ نہیں تھا کہ جنرل صاحب کور کمانڈروں کو آگاہ نہیں رکھتے تھے، لیکن اتنا ہی بتاتے جتنا مناسب ہوتا۔ یعنی need to know basis کی بنیاد پر۔ کیا کچھ چھپا رہتا، بعد میں پتا چلتا۔ ہر کانفرنس میں لمبی لمبی باتیں کرتے، پھر لوگوں کو بولنے کا موقع دیتے، تسلی سے بات سنتے، صرف شکوے مٹانے کے لیے۔ لیکن اگر کوئی ان کی سوچ سے زیادہ دور ہٹ جاتا، یا وہ دیکھتے کہ مخالفت بڑھ رہی ہے تو ناراض ہو جاتے۔ پھر چپ چھا جاتی۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ مسئلہ زیادہ گھمبیر ہوتا گیا۔ آخری دنوں میں کچھ سننے کا حوصلہ ہی نہیں رہا۔ لوگ زیادہ اختلافات کرنے سے کتراتے۔ کچھ تو ہلکا سا اشارتاً کہہ کر کنارے ہو جاتے کہ میں نے تو کہہ دیا اور اس طرح سرخرو ہو جاتے۔ کچھ ایسے بھی تھے جو مباحثہ کرتے، ان کی باتیں بھی سنتے، غصہ بھی سہتے۔ مگر آخر میں جنرل صاحب کرتے وہی جو کر رہے ہوتے۔ کہتے تم لوگوں کی نظر پوری تصویر پر نہیں۔ میں اسے دیکھتا ہوں اور بہتر سمجھتا ہوں۔

مارچ 2002ء میں ریفرنڈم کی خبریں آنے لگیں اور کور کمانڈر کی ایک کانفرنس میں جنرل مشرف نے یہ بات اٹھائی کہ صدر کو پانچ سال کے لیے قانونی طور پر جائز (legitimate) قرار دینے کے لیے کیا کیا جائے؟ کچھ نے کہا ریفرنڈم کرائیں، کچھ نے کہا الیکشن کے بعد پارلیمنٹ کا راستہ لیں، کچھ نے کہا صدارتی نظام لگا دیں۔ مگر سب نے اس بات پر زور دیا کہ صاف ستھرا نظام لائیں، خراب لوگوں کو اندر نہ آنے دیں۔ پھر اپریل میں جب ریفرنڈم ہوا تو کئی جگہوں پر جتنے ووٹ جنرل مشرف کو ملے کُل اتنے ووٹر بھی نہ تھے۔ سول سروس خدمت کے لیے بچھ گئی۔ فوج کو سیکورٹی کا کام سونپا گیا اور عام تاثر یہ دیا گیا کہ ریفرنڈم فوج کروا رہی ہے۔ ایسا ہرگز نہیں تھا۔ کوئی بھی الیکشن فوج نہیں کرواتی۔ نہ ہی وہ پولنگ بوتھ کے اندر جا سکتی ہے اور نہ ہی اس جگہ داخل ہو سکتی ہے جہاں ووٹوں کی گنتی ہوتی ہے۔ بس گنتی ختم ہونے پر نتیجہ جب باہر نکلتا، وہ حاصل کر کے تیزی سے اپنے مواصلاتی نظام پر ہمیں بھیج دیتی۔ جو نتیجہ ٹی وی پر دکھایا جاتا تھا وہ بہت کم کر کے دکھایا جاتا، ورنہ جو ووٹوں کی گنتی کا اصل نتیجہ فوج کو موصول ہو رہا تھا، دیکھ کر ہنسی آتی تھی۔ افسوس، میں نے اپنی زندگی کا پہلا اور شاید آخری ووٹ اس ریفرنڈم میں مشرف صاحب کو دیا۔

اس کے نتائج کے خلاف کافی شور مچا، مگر معاملہ رفع دفع کر دیا گیا۔ جنرل مشرف نے معافی مانگ لی اور پانچ سال کے لیے صدر مقرر ہوئے۔ اس موڑ پر پہنچ کر قوم میں آخر یہ بات کھلنے لگی کہ حاکم ایسا نہیں جیسا سمجھتے تھے۔ جو اندر بیٹھے تھے پہلے سے جانتے تھے، مگر جب اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار چکے ہوں تو پھر لنگڑا کر چلنے کے سوا چارہ ہی کیا تھا؟

نواز شریف صاحب کو جہاز ہائی جیکنگ کی عمر قید سزا ملی۔ پھر وہ مشرف صاحب سے کوئی معاہدہ کر کے ملک سے باہر چلے گئے۔ میں جانتا نہیں کیا معاہدہ تھا۔ 31 جنوری 2002ء کو کور کمانڈر کانفرنس میں سیاسی حالات پر خیالات کا اظہار کرتے ہوئے جنرل مشرف نے کہا کہ ہم PML(Q) کی امداد کریں گے، جو ان دنوں طارق عزیز (principal secretary) صاحب کی کوششوں سے تشکیل دی جا رہی تھی۔ کہنے لگے کہ PPP کو توڑا جائے گا اور PML(N) کو کمزور کیا جائے گا۔ اگست 2002ء کے الیکشن کی تیاری کا عجب تماشہ تھا۔

ووٹ دینے کی عمر 21 سے گھٹا کر 18 سال کر دی گئی، کیونکہ اندازہ تھا کہ اس گروپ میں روشن خیال اعتدال پسندی (Enlightened Moderation) کے پروگرام کی وجہ سے جنرل مشرف کے حامی زیادہ ہوں گے۔ خیال تھا کہ خواتین کے لیے جتنے کام مغربی ممالک کو خوش کرنے کے لیے کیے ہیں، ان سے خواتین میں بھی مقبولیت ہو گی۔ اس مقبولیت کو اور بڑھانے کے لیے انہیں اسمبلی میں 60 مخصوص (reserved) سیٹوں کا کوٹہ الاٹ کیا گیا، تاکہ خواتین کا زیادہ سے زیادہ ووٹ حاصل کیا جا سکے۔ اس ہی طرح اقلیتوں کو بھی بالواسطہ حیثیت سے منتخب ہونے کے علاوہ عام انتخابات میں ووٹ ڈالنے کی اجازت بھی دی گئی۔ دین کے خلاف اپنے اس نئے پروگرام کی وجہ سے ان کا بھی تعاون حاصل تھا۔ پھر الیکشن میں حصہ لینے کے لیے گریجویشن کی شرط رکھ دی کہ زیادہ پرانے سیاستدانوں کا صفایا کیا جا سکے۔ یہ بھی قانون بنا دیا کہ کوئی بھی دو مرتبہ وزیر اعظم یا صدر نہیں رہ سکتا۔ بینظیر اور نواز شریف تو یوں باہر ہوئے۔ آخر میں نیشنل اسمبلی کی سیٹیں 217 سے بڑھا کر 342 کر دیں۔ الیکشن کے حلقوں کی پرانی حدیں تبدیل ہو گئیں، خواہش کے مطابق نئی حد بندیاں کی گئیں اور نئی سیٹوں پر اپنے لوگوں کے جیتنے کی امید زیادہ ہوئی۔ ناظمین نے بھی خوب ساتھ دیا۔ لیکن ان تمام کے باوجود الیکشن دھاندلی کے الزامات سے بھرے پڑے تھے۔

مشرف صاحب نے 2004ء کے آخر تک وردی اتارنے کا وعدہ کیا۔ پھر ایک فوج کی سالانہ کانفرنس میں، جہاں تمام جنرل حاضر تھے، اس پر بات کی۔ میں نے کہا کہ فوج آج تک پچھلے فوجی حکمرانوں کے کیے پر بدنام ہے۔ 1971ء کا کیچڑ آج بھی ہر فوجی، جو اس وقت پیدا بھی نہیں ہوا تھا، اپنے منہ پر لیے پھرتا ہے۔ آپ نے جو وعدے کیے تھے، ہم ان کے قریب بھی نہیں پہنچے۔ جس کام کا بیڑا اٹھایا ہے اسے پورا کریں۔ اگر آپ اس حال میں ملک کو چھوڑ کر جائیں گے تو فوج کبھی اس بدنامی کے داغ کو نہیں دھو سکے گی۔ کہنے لگے میں صرف وردی اتارنے کا پوچھ رہا ہوں، گھر جانے کا تو نہیں کہہ رہا۔ انہوں نے میری پوری بات میں صرف یہی سنا۔ میں نے کہا جب وردی اتاری تو سمجھیں گھر گئے۔ کافی دیر اس موضوع پر بات ہوئی، مگر میں اور کچھ نہ بولا۔ سوچا یہ بھی نہ کہتا تو بہتر تھا، غلطی کی۔ جنرل مشرف سے اتنی ناامیدی کے باوجود، مجھے سیاستدانوں سے کسی قسم کی بہتری کی کوئی امید نہیں تھی اور نہ ہی اس سیاسی نظام پر کوئی بھروسہ تھا۔ کچھ نے وردی اتارنے کا کہا، کچھ نے کہا نہ اتاریں۔ کہنے لگے میں سوچ کر فیصلہ کروں گا۔ پھر مشرف صاحب کے آخری دنوں میں فوج کو وہ وقت بھی دیکھنا پڑا کہ فوجی منہ چھپاتے پھرتے تھے۔ گھر سے سول کپڑے پہن کر نکلتے اور وردی دفتر میں جا کر پہنتے۔ محفل میں تعارف کراتے تو اپنا عہدہ چھپاتے۔ (جاری ہے)

☆☆☆☆☆

عسکری ساز و سامان میں کمیشن کی وبا ختم کرائی

وزارت دفاع نے اسلحہ بیچنے والی کمپنیوں کو فری ہینڈ دے رکھا تھا-کاروباری نمائندوں کا جی ایچ کیو میں داخلہ بند کرادیا

مشرف کی ناراضگی کے باوجود سیکورٹی کلیئرنس دینے سے بھی انکار کردیا-جنرل (ر) شاہد عزیز کی کتاب سے اقتباسات
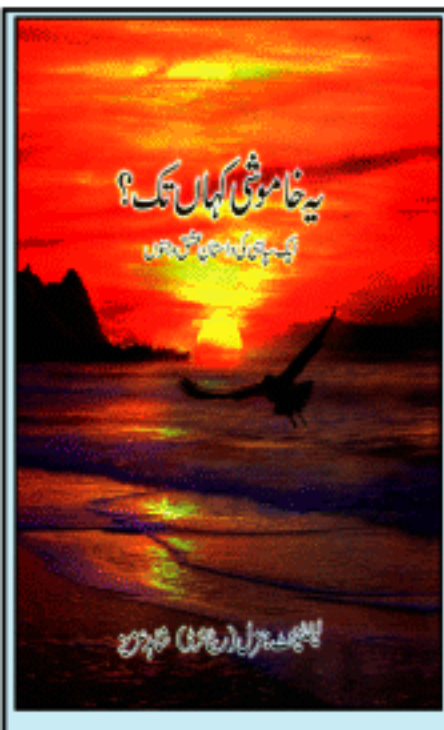
لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کا شمار افواج پاکستان کے مایہ ناز، بلند ہمت، باکردار اور اصول پسند افسران میں ہوتا ہے۔ انہیں جس قدر کامیابیاں حاصل ہوئیں، اس کی وجہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر مکمل یقین ہے۔ جہاں کہیں بھی وطن عزیز کے دفاع اور قومی مفادات کا معاملہ سامنے آیا، وہ حکمرانوں کے سامنے بڑی جرأت اور استقامت سے حاضر سروس جنرل ہوتے ہوئے بھی اختلافی رائے پیش کرتے رہے۔ ڈائریکٹر جنرل تجزیاتی ونگ کی حیثیت سے کارگل کے محاذ کے حوالے سے انہوں نے ہمیشہ حقیقت پسندانہ تجزیہ اعلیٰ فوجی حکام کو مہیا کیا۔ نائن الیون (11/9) کے بعد امریکہ کیلئے فوجی سہولتوں کی فراہمی کے معاملے پر بھی اعلیٰ سطحی فوجی اجلاس میں کھل کر کلمہ حق بلند کیا۔ ان کی ملازمت کا عرصہ فیض کے اس مصرعے کی عملی تفسیر رہا: جو رکے تو کوہ گراں تھے ہم، جو چلے تو جاں سے گزر گئے

لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کی اجازت سے، ان کی کتاب "یہ خاموشی کہاں تک" سے منتخب اقتباسات قارئین کی معلومات اور دلچسپی کے لیے پیش کیے جارہے ہیں۔

"میں کل آرہا ہوں، مجھے بہت اچھی نوکری مل گئی ہے، اب اسلام آباد ہی میں رہوں گا"۔ میرے ایک بہت قریبی رشتہ دار کا، جو اُن دنوں نوکری کے سلسلے میں پریشان رہتے تھے، فون تھا۔ کہنے لگے، آپ سے بھی تعلق رہے گا۔ میں نے پوچھا کیسا تعلق، تو کہا کہ آکر بتاؤں گا۔ میں ابھی نیا نیا ہی CGS بنا تھا، گھر بھی نہیں ملا تھا، میس میں رہ رہا تھا۔ جب آئے تو کہنے لگے، اسلام آباد میں اتاترک روڈ پر ایک شاندار مکان بھی مل رہا ہے، تنخواہ بھی بہت اچھی ہے۔ پتا چلا کہ پاکستان کی ایک اثر و رسوخ رکھنے والی کاروباری شخصیت نے، اپنے فوج سے منسلک کاروبار کے دفتر کا سربراہ بنا لیا ہے۔ اُن کے دفتر میں چند ریٹائرڈ بریگیڈیئر صاحبان بھی ملازم تھے، جو اب اِن کے نیچے کام کریں گے۔ یہ کمپنی فوج کو ہیلی کاپٹر اور دیگر بڑے ساز و سامان فراہم کرتی تھی اور ان کا کاروبار کئی ممالک میں پھیلا ہوا تھا۔ میں چونک پڑا۔ یہ مجھ پر ہتھیار فروشوں کا پہلا حملہ تھا۔

میں نے اپنے رشتہ دار سے کہا تم کن چکروں میں پڑ گئے، تمہیں تو یہ بھی نہیں پتا کہ بندوق میں گولی کدھر سے ڈالتے ہیں، اتنا بڑا کاروبار کیسے سنبھالو گے؟ کہنے لگے آپ فکر نہ کریں میں سب سنبھال لوں گا۔ میں نے کہا آپ کا جہاں جی چاہے نوکری کریں، مگر مجھ سے کوئی توقع نہ رکھیں۔ کہنے لگے، نہیں آپ سے کیا توقع رکھنی، کیا میں آپ کو جانتا نہیں؟ آپ کو تنگ نہیں کروں گا۔ بس اگر کہیں ملاقات کرنی ہو تو آپ اتنا کر دیں کہ اُن سے کہہ دیں کہ وہ ہم سے مل لیں، باقی میں سنبھال لوں گا۔ آپ سے غلط کام تو کروانا نہیں۔ میں نے کہا میں اس سلسلے میں کوئی ٹیلیفون نہیں کروں گا اور نہ ہی اس قسم کی اور کوئی امداد کر سکتا ہوں۔ ایک ٹیلیفون سے ہی ان کا سب کام ہو جاتا اور میرا کام تمام۔ مجھ پر خاندان والوں کا بھی بوجھ پڑتا رہا کہ تم سے اتنا بھی نہیں ہو سکتا کہ اپنوں کی ذرا سی مدد کر دو؟ میں نے کہا، ذاتی طور پر ہر مدد کیلئے تیار ہوں، لیکن اپنے دفتر سے نہیں۔ پھر طعنے بھی سنے کہ اب بڑے آدمی بن گئے ہیں، نظریں پھیر لی ہیں۔ غرور اور خودغرضی کے الزامات بھی سہے۔ نہ جانے اس کاروباری شخصیت نے انہیں کیسے ڈھونڈ نکالا تھا۔

فوج میں ہر سال بجٹ کا ایک بڑا حصہ فوجی سامان کی خرید میں لگتا ہے۔ فوج کے اندر یہ سارا سلسلہ CGS کے تحت کام کرتا ہے۔ ایک مخصوص ڈائریکٹریٹ، W&E (Weapons and Equipment Directorate)، اس کام کیلئے موجود ہے۔ اس کے ساتھ ایک ITD (Inspectorate of Technical Development) ہے جو تمام اشیا کی فنی موزونیت کو جانچتی ہے۔ فوج کے ہر شعبے کی اپنی ڈائریکٹریٹ بھی CGS کے نیچے کام کرتی تھی۔ یہ ڈائریکٹریٹس اپنی ضروریات کی فہرست بناتیں اور MO ان کا تجزیہ کرتا، تاکہ ضروریات کو اہمیت کے لحاظ سے ترجیح دی جاسکے۔ پھر ایک سالانہ کانفرنس میں CGS، بجٹ کو دیکھتے ہوئے ان تجاویز پر فیصلہ کرتا ہے کہ کیا کچھ اس سال خریدا جائے گا۔ اس حتمی لسٹ کو وزارتِ دفاع بھیج دیا جاتا ہے، پھر ان کی خریداری وہی کرتے ہیں۔ اس کام کی نگرانی اور وزارتِ دفاع سے ارتباط W&E کرتی ہے۔ اگر کوئی نیا سامان ہو تو فوج میں اس کو آزمایا (trials) جاتا ہے۔ سامان بیچنے والی کمپنیوں کے نمائندے، اس سلسلے سے منسلک تمام فوجی دفتروں سے اپنا میل جول شروع کرتے ہیں، پھر ITD اور W&E میں اثر و رسوخ استعمال ہوتا ہے اور آخر میں ساری توجہ وزارتِ دفاع پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ میں MO میں دو سال بریگیڈیئر کے طور پر اور پھر دو سال DGMO کے طور پر اس کام سے منسلک رہا۔ پھر CGS کے طور پر دو سال اس تمام عمل کی سربراہی کی اور بغور مشاہدہ بھی۔ میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اس کام میں فوج کا بہت سا پیسہ کمیشن کی صورت میں، کچھ مخصوص لوگوں کی جیبوں میں پہنچ جاتا ہے۔

MO میں دو مختلف عہدوں پر تجربے کے بعد، جہاں مجھ پر ہتھیار فروشوں کی زور آزمائی ہو چکی تھی، میں نے آتے ہی اس سلسلے کو محدود کرنے کیلئے اقدامات لینے شروع کر دیئے۔ پہلا کام یہ کیا کہ جو ان کے نمائندے GHQ میں کھلے عام پھرتے تھے، ان کا داخلہ بند کیا۔ اُن کے لیے ایک گیٹ کے نزدیک پرانی بیرک کو ٹھیک کروا کر اُس میں کئی کمرے میٹنگ کیلئے بنوائے۔ پھر اس کا ایک باقاعدہ نظام قائم کیا۔ W&E میں ایک ٹیلیفون نمبر دیا جس پر تمام ملاقاتی کا ٹائم لیتے۔ ملاقات میں GHQ کے کم از کم تین افسر موجود ہوتے۔ W&E کا متعلقہ افسر، اُس ڈائریکٹریٹ کا افسر جن کا سامان ہوتا اور ITD کا افسر۔ ملاقات صرف دی ہوئی جگہ پر ہوتی اور اس کی تفصیل کا باقاعدہ ریکارڈ رکھا جاتا۔ ملاقات کے کمرے MI کے انتظام میں تھے اور ہر کمرہ ٹی وی کیمرے سے آراستہ۔ اس کی آگاہی کیلئے نشانات بھی لگا دیئے گئے کہ ہر کمرہ ٹی وی کیمرے سے مانیٹر ہوتا ہے۔ MI بھی ملاقاتیوں کا ریکارڈ رکھتی۔

پھر یہ احکامات جاری کیے کہ کوئی بھی افسر جو فوجی سامان کی خرید سے منسلک ہے، ان کمپنیوں کے نمائندوں سے کسی قسم کا رابطہ نہیں رکھے گا، سوائے مخصوص ملاقات کی جگہ پر۔ ان سے فون پر رابطہ رکھنا، ان سے ملاقات یا ان کی دعوت میں شمولیت یا تحائف وصول کرنا قانون کی خلاف ورزی قرار دی۔ کچھ اعتراضات مجھ تک پہنچے کہ افسران پر اعتبار نہیں کیا جارہا۔ میں نے کہا کہ آپ سب ہی جانتے ہیں کہ یہ سلسلہ کس قدر بدنام ہے تو بہتر نہیں کہ ہر بات کھلی ہو اور آپ کا نام محفوظ رہے؟ یہاں تکلف کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ کافی کوشش کی کہ وزارتِ دفاع اور GHQ مل کر پورے نظام کا تجزیہ کر لیں، تاکہ کرپشن کی روک تھام کی جاسکے، مگر منسٹری کا کہنا تھا کہ ہمارے طریقے صحیح چل رہے ہیں، کوئی رد و بدل کی ضرورت نہیں۔ آپ GHQ میں جو چاہیں کریں، وزارتِ دفاع کے کام میں دخل نہ دیں۔

میں نے پھر اپنے رشتے دار سے کہا کہ آپ جب تک فوج سے منسلک کاروباری ادارے کے ساتھ نوکری کر رہے ہیں یا میں جب تک اس کرسی پر ہوں، مجھ سے تعلق نہ رکھیں، نہ ہی میرے گھر آئیں اور نہ ہی گھر میں کسی کو ٹیلیفون کریں۔ اس کے علاوہ آپ کی اپنی مرضی ہے جو چاہیں بخوشی کریں۔ میں آپ کو نوکری سے منع نہیں کروں گا، وہ آپ کا فیصلہ ہے۔

قانونی ماہرین سے مشورہ کیا کہ میں ایسے کاروباری شخص کو بلیک لسٹ (black list) کر سکتا ہوں جو فوج کیلئے سامان خریدنے کے نظام کو یوں ناکارہ (neutralize) کرنے کی کوشش کرے۔ تاہم اگر اس سلسلے میں کوئی قانونی کارروائی کی بھی جاتی تو نہایت پیچیدہ ہوتی۔ میں نے پھر DGMI سے مشورہ کیا اور ان حضرت کے بارے میں تمام فوج سے منسلک دفاتر میں ایک سرکاری خط بھجوا دیا۔ اس میں لکھا کہ ان صاحب کی سیکورٹی کلیئرنس (security clearance) نہیں ہے اور جب تک یہ سیکورٹی کے لحاظ سے کلیئر نہیں کیے جاتے ان سے کسی قسم کا تعلق نہ رکھا جائے۔ یہ خط میں نے GHQ کے تمام دفتروں کے علاوہ POF (Pakistan Ordnance Factories) واہ اور HIT (Heavy Industries Taxila)، کو بھی بھجوا دیئے اور اس کی ایک کاپی برائے اطلاع وزارتِ دفاع کو بھی۔ ان کا فوج کے ساتھ کاروبار رک گیا۔

کچھ ہی دن گزرے تھے کہ DGMI صاحب میرے پاس آئے اور کہا کہ جنرل مشرف صاحب بہت خفا ہیں کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ کہنے لگے میں نے انہیں بتایا تو انہوں نے کہا کہ شاہد کو چاہئے کہ اپنے رشتے دار کو روکے، اسلحے کے کاروبار کرنے والی فرم کے مالک کا کیا قصور ہے، اس کو کیوں دبایا جارہا ہے؟ میں نے کہا کہ اُن سے کہہ دیں کہ میں اُس کے خلاف کارروائی کروں گا جس سے فوج سرکاری طور پر کاروبار کرتی ہے، اُس کمپنی کے ملازمین سے مجھے غرض نہیں۔ انہوں نے پھر دوبارہ مجھے غصے سے بھرا پیغام بھجوایا کہ عجیب سر پھرا انسان ہے۔ میرے دو سال وہاں رہتے میں فوج نے اُن صاحب سے کوئی کاروبار نہیں کیا۔ میرے رشتے دار کی نوکری بھی چھوٹی۔ جب میں اُس کرسی سے ہٹ رہا تھا تو وہ مجھ سے ملنے آئے اور معذرت کی کہ میں آپ کو سمجھ نہ پایا تھا۔ میں نے آتے وقت وہ خط جس سے اُن کا کاروبار کا ہوا تھا منسوخ کروا دیا۔ (جاری ہے)

☆☆☆☆☆

روزنامہ امت کراچی/حیدرآباد

قسط نمبر 18

"روشن خیال اعتدال پسندی کا نسخہ امریکہ کا تجویز کردہ تھا"

ذہنوں کو قابو کرنے میں ٹی وی چینلز آگے رہے-فرقہ وارانہ تنظیموں کو جہادیوں سے ملایا گیا-حقوق نسواں عورتوں کی آزادی قرار پائی- ملک میں پھیلتی فحاشی پر افسران کی تشویش کو مشرف نے ہنس کر ٹال دیا- جنرل (ر) شاہد عزیز کی کتاب سے اقتباس
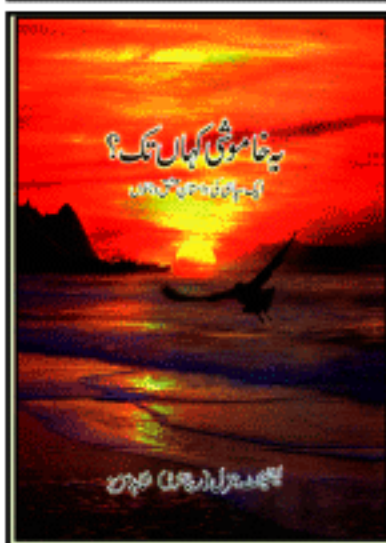
لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کا شمار افواج پاکستان کے مایہ ناز، بلند ہمت، باکردار اور اصول پسند افسران میں ہوتا ہے۔ انہیں جس قدر کامیابیاں حاصل ہوئیں، اس کی وجہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر مکمل یقین ہے۔ جہاں کہیں بھی وطن عزیز کے دفاع اور قومی مفادات کا معاملہ سامنے آیا، وہ حکمرانوں کے سامنے بڑی جرأت اور استقامت سے حاضر سروس جنرل ہوتے ہوئے بھی اختلافی رائے پیش کرتے رہے۔ ڈائریکٹر جنرل تجزیاتی ونگ کی حیثیت سے کارگل کے محاذ کے حوالے سے انہوں نے ہمیشہ حقیقت پسندانہ تجزیہ اعلیٰ فوجی حکام کو مہیا کیا۔ نائن الیون (11/9) کے بعد امریکہ کیلئے فوجی سہولتوں کی فراہمی کے معاملے پر بھی اعلیٰ سطحی فوجی اجلاس میں کھل کر کلمۂ حق بلند کیا۔ ان کی ملازمت کا عرصہ فیض کے اس مصرعے کی عملی تفسیر رہا:

جو رکے تو کوہِ گراں تھے ہم، جو چلے تو جاں سے گزر گئے لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کی اجازت سے، ان کی کتاب "یہ خاموشی کہاں تک" سے منتخب اقتباسات قارئین کی معلومات اور دلچسپی کے لیے پیش کیے جا رہے ہیں۔

25 دسمبر 2003ء، قائداعظم کی یومِ پیدائش کا دن، میں گاڑی میں بیٹھا لاہور کی طرف روانہ تھا، لاہور کے کور کمانڈر کا منصب سنبھالنے۔ ابھی کار راولپنڈی سے نکلی نہیں تھی کہ دو زوردار دھماکوں کی آوازیں سنیں۔ فون کیا تو پتا چلا کہ جنرل مشرف پر خودکش حملہ ہوا ہے۔ اللہ نے بچا لیا۔

CGS کی کرسی پر دو سال مجھ پر بہت بھاری گزرے۔ سب کچھ ہی غلط ہوا۔ افغانستان پر غیر جانبداری کا جھانسہ دے کر امریکہ سے گٹھ جوڑ کیا اور مسلمانوں کے قتل و غارت میں شامل ہوئے۔ نئے نظام کے وعدے پر آنے والا ڈکٹیٹر ریفرنڈم کے جعلی نتیجے کے بل بوتے پر پانچ سال کے لیے صدر بنا۔ نااہل اور کرپٹ سیاستدانوں کی حکومت قائم کی گئی۔ امریکہ کے دباؤ پر کشمیر کو خیرآباد کہا۔ بلوچستان میں علیحدگی پسندی کی آگ لگائی گئی۔ کاروباری ٹی وی چینلز کھولنے کا فیصلہ کر کے قوم کی فکریں بھی منڈی میں رکھ دیں۔ پھر "سب سے پہلے پاکستان" کا دوغلا نعرہ لگایا اور دین کو روشن خیال اعتدال پسندی (enlightned moderation) کا نیا رنگ دیا...... دینِ اکبری سے آگے نکل کر، دینِ پرویزی۔ پاکستان میں دین کا رجحان ختم کرنے کے لیے یہ نسخہ امریکہ کا تجویز کردہ تھا۔ قبلہ واشنگٹن کی طرف موڑنے کے بعد، آہستہ آہستہ لوگوں کے ذہنوں کو قابو کرنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ تمام ٹی وی چینلز پیش پیش رہے۔ ایک سے ایک عالم اور فقیہ خریدے گئے۔ فرقہ وارانہ تنظیموں کو جہادیوں سے جا ملایا۔ پھر مُلّا کی جہالت کو مروڑ کر دین کو بدنام کیا اور اُسے نیا رنگ دے کر، نئی اصطلاحات پیش کی گئیں۔ اسلام کے قواعد پر چلنے کو "بنیاد پرستی" کہا گیا، پھر اُسے "شدت پسندی" سے جا ملایا۔ کچھ سچ میں تمام جھوٹ ملا کر، ڈھولک کی تھاپ پر ایک ناچتا ہوا معاشرہ سیدھی راہ بتائی گئی، جہاں ہر شخص کو اللہ کی رضا چھوڑ کر اپنی من مانی کی چھوٹ ہو۔ جب منزل دنیا کی رعنائیاں ہی ہو اور دھن دولت ہی خدا ہو، تو پھر یہی سیدھی راہ ہے۔

پھر عورتوں پر معاشرے میں ہوتے ہوئے مظالم کو دینی رجحان سے منسلک کیا گیا اور حقوقِ نسواں کو آزادیٔ نسواں کا وہ رنگ دیا کہ عورت کو عزت کے مرتبے سے گرا کر نیم عریاں حالت میں لوگوں کے لیے تماشہ بنایا۔ ایک مرتبہ کور کمانڈر کانفرنس میں کور کمانڈروں نے ملک میں پھیلتی ہوئی فحاشی پر اظہارِ تشویش کیا، تو مشرف صاحب ہنس کر کہنے لگے، میں اس کا کیا کروں کہ لوگوں کو ایک انتہا سے روکتا ہوں تو وہ دوسری انتہا کو پہنچ جاتے ہیں۔ بات کو ہنسی میں ٹال دیا۔ مگر حقیقت مختلف تھی۔ صدر صاحب کی طرف سے باقاعدہ حوصلہ افزائی کی گئی اور پشت پناہی ہوئی تو بات یہاں تک پہنچی۔ اس سلسلے میں کئی NGOs بھی کام کر رہی تھیں اور بے بہا پیسہ خرچ کیا جا رہا تھا۔ یہ سب کی آنکھوں دیکھا حال ہے۔

جنرل مشرف خود کو معتدل مسلمان کہتے تھے اور شروع سے ہی اپنے آپ کو کمال اتاترک کے رنگ میں رنگ لیا تھا۔ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ ایک لیڈر کی پہلی ترجیح اپنے ملک اور عوام کی زندگی اور املاک کو تحفظ دینا ہے اور مُلّا عمر جیسے لوگ دین کو دنیا کے مال و متاع اور زندگی پر ترجیح دیتے ہیں (انگریزی کتاب کا صفحہ 216)۔ صرف الفاظ میں تھوڑا گھماؤ ڈال دیا کہ "دین" کی جگہ "اپنے اصولوں اور روایات" کے الفاظ استعمال کیے۔ مُلّا عمر کے اصول دین سے تھے، روایات اپنی تھیں۔ ان دونوں کو گڈمڈ کر دیا کہ مسلمان ناراض نہ ہوں اور مغربی معاشرہ، جن کے لیے یہ کتاب لکھی گئی، اصل مطلب سمجھ سکیں اور داد دیں۔ لب لباب وہی ہے کہ آخرت کو اس دنیا پر ترجیح دینا جہالت ہے۔ دو مختلف موقعوں پر، میری موجودگی میں، افسران سے خطاب کرتے ہوئے، ایک حدیث کے حوالے سے کہا "اس ملک کے حالات کیسے سدھر سکتے ہیں جس کے لوگ اس دنیا کو قید خانہ سمجھتے ہوں اور اگلی دنیا کی ہی فکر میں لگے رہتے ہوں؟ پھر اُن کی یہ دنیا تو برباد ہی رہے گی"۔ میری ریٹائرمنٹ کے بعد، مارچ 2006ء میں، جن دنوں میں NAB میں تھا، امریکہ کے صدر حضرت جارج بش اسلام آباد تشریف لائے۔ رات کو پریزیڈنٹ ہاؤس میں کھانا ہوا اور ایک ثقافتی پروگرام پیش کیا گیا۔ پروگرام میں پاکستان کی تہذیب پر ایک نگاہ ڈالی گئی کہ ہماری تہذیب پر تاریخ کے کیا اثرات رہے۔ پہلی تصویر ہمارے معاشرے کی موہنجوڈارو کے ادوار کی پیش کی گئی۔ نیم عریاں لڑکیوں نے ناچ کر ہمیں سمجھایا کہ ہماری ثقافت کی ابتدا کہاں سے ہوئی۔ پھر بتایا گیا کہ الیگزینڈر کے آنے سے ہم نے ایک نیا رنگ حاصل کیا۔ اس رقص میں فیشن بھی بدل گیا اور لباس بھی مزید سکڑ گئے۔ پھر اگلا رقص عکاسی کرتا تھا، ہندوانہ تہذیب کی برہنگی کا، جس کا اثر ہماری تہذیب پر رہا۔ جب لباس غائب ہونے لگے تو میں ڈرا کہ آگے کیا آئے گا۔ لیکن پھر کافرستان کی رقاصائیں آ گئیں کہ یہ اب بھی یہاں ناچتی ہیں۔ صرف اس ایک پیشکش میں کچھ ملبوس نظر آئے۔ اگلے رقص میں چھتریاں لیے برطانیہ کی میم صاحبائیں دکھائی گئیں، جنہوں نے چھتریوں کے علاوہ دستانے بھی پہنے تھے اور کچھ رومالیاں سی باندھی ہوئی تھیں۔ پھر اگلے رقص میں پاکستان کی موجودہ تہذیب کی عکاسی میں لڑکوں اور لڑکیوں نے مل کر، خفیف سے ملبوس میں جنسی کنائیوں (sexual innuendoes) سے بھرپور رقص پیش کر کے حاضرین کو محظوظ کیا۔ آخر میں ایک اور انوکھا رقص پیش کیا گیا اور کہا گیا کہ یہ وہ مستقبل ہے جس کی طرف ہم رواں ہیں۔ اسٹیج پر برہنہ جانوروں کی مانند بل کھاتے ہوئے اپنے مستقبل کی تصویر دیکھ کر جی چاہا شرم سے ڈوب مروں، مگر میری حیوانیت نے آنکھیں بند نہ ہونے دیں۔ بچپن میں سنا تھا کہ یہاں کبھی محمد بن قاسم بھی آیا تھا اور بہت سے بزرگانِ دین بھی، لیکن شاید ان کا کچھ اثر باقی نہ رہا تھا۔ جب ہم اپنا تماشہ دکھا چکے اور حضرت بش اٹھ کر جانے لگے تو تمام مجمع ان کے پیچھے دروازے کی طرف بڑھا۔ وہ دروازے پر پہنچ کر رک گئے۔ پھر ہماری طرف مڑے تو سارا مجمع بھی ٹھہر گیا۔ دانت نکال کر اپنے مخصوص انداز میں مسکرائے، گھٹنے جھکا کر کولہے مٹکائے، دونوں ہاتھوں سے چٹکیاں بجائیں اور سر ہلا کر تھوڑا اور مٹک کر دکھایا، جیسے کہہ رہے ہوں "ہن نچو"۔ جس کی خوشی کے لیے ہم نے قبلہ بدل لیا، اپنی تاریخ جھٹلا دی، اپنا تمدن نوچ کر پھینک دیا، وہ بھی لعنت کر گیا۔ (جاری ہے)

☆☆☆☆☆

بدھ 20فروری 2013ء

روزنامہ امت کراچی/حیدرآباد

قسط نمبر 19

مُشرف نے مُلک مُیں سیکولر سوچ کو فروغ دیا

نصابِ تعلیم میں ردوبدل کیا گیا- جہاد والی آیات نکال دی گئیں- تعلیمی اداروں کو مغربی این جی اوز کی نگہداشت میں دیدیا گیا- جدید تعلیم کیساتھ دینی علوم کی میری تجویز ہنسی میں اڑادی گئی- جنرل (ر) شاہد عزیز کی کتاب سے اقتباس

ہم کسی کے گھر کھانے پر مدعو تھے اور مدرسوں کا رنگ بدلنے پر بات ہو رہی تھی۔ جنرل مشرف بھی موجود تھے۔ ان کے سامنے میں نے کہا کہ ہم مدرسوں میں جدید تعلیم دلوانا چاہتے ہیں، بہت اچھی بات ہے لیکن ساتھ ساتھ اسکولوں میں بھی ایسی تعلیم دی جائے کہ دین کی صحیح سمجھ حاصل ہو سکے، ورنہ ہم معاشرے میں دو طرح کے افراد پیدا کریں گے اور ان کے بیچ ہمیشہ کھچاؤ رہے گا۔ پھر جب مدرسوں کے بچے جدید تعلیم بھی حاصل کر لیں گے تو یہ کھچاؤ اور بڑھ جائے گا، کیونکہ یہ پھر ملازمتوں کے لیے عام بچوں سے مقابلہ کریں گے۔ ہر دفتر میں دونوں مکتبوں سے آئے لوگ ہوں گے اور گروہ بن جائیں گے۔ یہ تاثر درست نہیں کہ مدرسوں میں جدید تعلیم پانے کے بعد یہ "روشن خیال" ہو جائیں گے۔ ہمیں چاہئے کہ مدرسوں اور اسکولوں کی تعلیم کو ایسے تشکیل دیں کہ دس یا پندرہ برسوں بعد دونوں تعلیمی نظام کسی حد تک متوازی آسکیں۔ پھر مسجد میں وہ نماز پڑھائے جس پر نمازیوں کا اتفاق ہو۔ یقیناً دین جس کے دل میں داخل ہو چکا ہو، وہ دین ہی کی راہ پر چلے گا، ورنہ دینی تعلیم حاصل کرنے والا بھی کاروباری سوچ کا مالک ہوگا، صرف دنیاوی فائدہ ڈھونڈے گا، چاہے مدرسے میں پڑھا ہو یا عام اسکول میں۔ اس شام کچھ اور بھی ایسے ہی روشن خیال مسلمان وہاں بیٹھے تھے۔ سب میری طرف پریشان نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ایک صاحب کہنے لگے۔ "اسکولوں میں تو جو دین کی تعلیم دی جاتی ہے، کافی ہے، اس میں کیا خرابی ہے؟" پھر کہا "مجھے دین کے بارے میں جو جاننا چاہئے، جانتا ہوں"۔ مجھ سے رہا نہ گیا، آواز اونچی ہوگئی، کہا "آپ کچھ بھی نہیں جانتے"۔ جانتا تو میں بھی نہ تھا، مگر مجھ سے برداشت نہ ہوا۔ انہوں نے میرا چیلنج قبول نہ کیا اور خاموش ہو گئے۔ میری بھی بچت ہوئی۔ پھر دوسرے بولے "جنرل صاحب، ہم پہلے ہی ان مولویوں سے تنگ ہیں، اب آپ چاہتے ہیں کہ پورے ملک کو ہی مولوی بنا دیں"۔ اس پر سب کھلکھلا کر ہنس دیئے اور موضوع بدل دیا گیا۔ یہ صرف "روشن خیال" لوگوں کی سوچ نہیں ہے۔ مدرسوں کے عالم بھی نہیں چاہتے کہ اسکولوں میں دین کی صحیح تعلیم دی جائے، ورنہ دین پر اُن کی اجارہ داری ختم ہو جائے گی۔ اس موضوع کو فرقوں کے جھگڑوں میں کچھ یوں الجھایا گیا ہے کہ آسانی سے کہہ دیا جاتا ہے "کس کا دین؟" یہ مسئلہ اتنا پیچیدہ نہیں جتنا دکھایا جاتا ہے۔

جن دنوں میں بریگیڈ کمانڈ کر رہا تھا، ایک دینی عالم سے رابطہ رہا۔ ایک مرتبہ میں نے کہا کہ فوج بھی اللہ اکبر کے نعرے پر لڑتی ہے۔ ہم بھی لوگوں کو دین کے جذبے سے ہی سرشار کرتے۔ ہمیں چاہئے کہ فوج کے افسران کو بھی مناسب دین کی تعلیم دی جائے۔ کہنے لگے "بریگیڈیئر صاحب یہ سوچ ٹھیک نہیں۔ بھلا بتائیں اگر میں آپ کا بریگیڈ لے کر میدانِ جنگ میں اُتر جاؤں تو سب ہی کو مروا دوں گا نا، کیونکہ مجھے لڑائی لڑنے کا ڈھنگ نہیں آتا۔ ہم دونوں کا اپنا اپنا کام ہے اور ہمیں چاہئے کہ مل کر کام کریں"۔

فوجی حکومت آچکی تھی اور میں مری میں ڈویژن کمانڈ کر رہا تھا، ایک مرتبہ وزیر مذہبی امور کو ملنے اُن کے دفتر گیا اور اس سلسلے میں بات کی۔ کہنے لگے "اسکولوں کا معاملہ میرے نیچے نہیں آتا، یہ وزیر تعلیم کا دائرہ کار ہے"۔ میں نے کہا "آپ ملک میں مذہبی امور کے وزیر ہیں، دیندار آدمی بھی لگتے ہیں، کیا آپ کو اس بات کی فکر نہیں کہ ملک کے سارے بچے اسکولوں میں دین کی سطحی سی تعلیم حاصل کر رہے ہیں؟ وزیر تعلیم کو دین سے کیا غرض؟" وہ کچھ نہ بولے۔ میز پر پڑے کاغذوں کو تکتے رہے۔ میں نے جھنجلا کر غصے سے کہا "کیا آپ صرف عمرے اور حج کروانے کے لیے وزیر لگائے گئے ہیں؟" اور اٹھ کر واپس آ گیا۔

جب حکومت دین سے منحرف کرنے والوں کی پشت پناہی کرنے لگے اور یہ تمام عوام پر اثر انداز ہو جائیں اور پھر اس سے آگے نکل کر کھلم کھلا اجتماعی طور پر اللہ کے احکامات کی خلاف ورزی پر عوام کو اُکسایا جائے تو یہ کسی کا ذاتی مسئلہ نہیں رہ جاتا۔ پھر حکومت اللہ کے احکام کے خلاف محاذ آرائی کر رہی ہے۔ ایسے میں ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اُسے روکے۔ اس سیکولر سوچ کو جنرل مشرف نے شروع سے ہی ملک میں فروغ دیا اور آج بات کہاں سے کہاں تک جا پہنچی ہے۔

یقیناً جہاد کا اعلان حکومت کا ذمہ ہے۔ کسی فرد یا تنظیم کو حق نہیں کہ اپنے طور پر جہاد کا اعلان کرے۔ لیکن اگر مسلمانوں کی حکومت کافروں کے ساتھ مل کر، ایک پڑوسی اسلامی مملکت پر حملے میں اُن کی اتحادی بن جائے اور مسلمانوں کے قتل و غارت میں برابر کی شریک ہو تو مسلمانوں کے لیے اللہ کا کیا حکم ہے؟ ایک دن میں کسی کے گھر بیٹھا تھا۔ مشرف صاحب بھی آئے اور آتے ہی کہنے لگے ذرا قرآن تو لایئے۔ ابھی ہم نئے نئے امریکہ کے اتحادی بنے تھے۔ پھر جیب سے ایک کاغذ نکالا اور کہا کہ آیت نمبر 28:3 نکالیں اور پڑھیں۔ اتنا پڑھا گیا، "مومنوں کو چاہئے کہ مومنوں کے سوا کافروں کو دوست نہ بنائیں اور جو ایسا کرے گا اُس کا اللہ سے (کچھ عہد) نہیں۔ ہاں اگر اس طریق سے تم اُن (کے شر) سے بچاؤ کی صورت پیدا کرو تو مضائقہ نہیں"۔ کہنے لگے کہ اللہ نے اس کی اجازت دی ہے، آج ایسے ہی حالات ہم پر ہیں۔ میں نے بھی اس پر زیادہ غور نہ کیا اور درست ہی جانا، مگر دل راضی نہ تھا۔ پھر اور باتیں ہونے لگیں۔

کافی عرصے بعد سورۃ آل عمران کی یہ آیات پھر میری نظروں سے گزریں۔ اس سے پہلے کی دو آیات کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ ہی بادشاہت کا مالک ہے، وہی بادشاہت عطا کرتا ہے، وہ ہی عزت اور ذلت دیتا ہے، ہر طرح کی بھلائی اُس ہی کے ہاتھ میں ہے اور وہ ہی ہر چیز پر قادر ہے۔ روز و شب وہ ہی ہم پر گزراتا ہے اور زندگی اور موت بھی وہ ہی دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے بے شمار رزق بخشتا ہے۔ اتنا کچھ بتانے کے بعد کہ ان تمام چیزوں کے طلبگار اللہ کے سوا کسی اور سے نہ ہونا، اللہ نے فرمایا کہ مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست نہ بناؤ، مگر ان کے شر سے بچاؤ حاصل کرنے کی اجازت دی۔ پھر آخر میں یہ کہا "اللہ تم کو اپنے (عذاب) سے ڈراتا ہے اور اللہ ہی کی طرف (تم کو) لوٹ کر جانا ہے"۔ یہاں شر سے بچاؤ میں اتنی چھوٹ نہیں کہ ہم مسلمانوں کے خون خرابے میں کافروں کے ساتھ بن جائیں۔ جس کے شر سے بچنے کے لیے کوئی ترکیب کرنی پڑے وہ یقیناً دوست تو نہیں ہو سکتا۔ ہاں، اس جھگڑے میں غیر جانبدار رہنے تک کی چھوٹ میں مان سکتا ہوں اور اُن دنوں جنرل مشرف کا اعلان بھی یہی تھا کہ ہم غیر جانبدار رہیں گے۔ بعد میں سرک سرک کر اُن کے مکمل ساتھی بن گئے۔ بلکہ کھل کر کہتے تھے کہ اگر اُن کا ساتھ نہ دیا تو ہماری معیشت کا کیا بنے گا؟ اور اُن ہی کی نظروں میں عزت پانا نصب العین جانا۔ بہت فکر رہتی کہ مغربی ممالک میں ہمیں اچھی نظروں سے نہیں دیکھا جاتا۔ یعنی عزت دینے والے بھی وہی اور رازق بھی وہی۔ آج بھی حکومت میں اور بہت سے مغربی ذہنیت رکھنے والوں میں یہی سوچ ہے۔

جن دنوں امریکہ عراق پر حملے کی تیاری کر رہا تھا تو امریکہ کے ایک اخبار میں خبر چھپی کہ حکومت نے ماہرین کی ایک ٹیم تشکیل دی ہے، جس کو یہ ذمہ داری سونپی گئی ہے کہ عراق پر قبضے کے بعد وہاں کے تدریسی نظام میں ایسی تبدیلیاں لائی جائیں کہ مغربی طرزِ زندگی کو اچھی نظر سے دیکھا جائے (to develop respect for western values)۔ امریکہ کے یہاں آنے پر ہمارے درسِ تعلیم پر بھی یہی سوچ اثر انداز ہوئی۔ تعلیمی نظام کو بہتر بنانے کے بہانے NGOs کے ذریعے پیسے دیئے گئے، پھر اس زور پر نصابِ تعلیم میں ردوبدل کی گئی، تاکہ تعلیم کو سیکولر رنگ دیا جائے، حتیٰ کہ نصاب سے جہاد کی تلقین والی آیات بھی نکال دی گئیں۔ یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ کتنے ہی ہمارے تعلیمی ادارے آج ان کی نگہداشت میں ہیں اور ہمارا مستقبل ان کی گود میں پلتا ہے۔

اس سیکولر سوچ سے مراد لادینیت نہیں ہے، بلکہ دین اور دنیا کو علیحدہ کرنا مقصود ہے۔ یعنی دین ذاتی سطح تک رہے اور حکومت کے کسی فیصلے یا امر میں اس کی مداخلت نہ ہو۔ فرعون کا بھی موسیٰ سے یہی جھگڑا تھا۔ "سب سے پہلے پاکستان" کے نعرے میں بھی چھپا ہوا یہی رنگ ہے۔ جب دین کو انفرادی حیثیت دے دی گئی تو کہہ دیا کہ دین فردِ واحد کا ذاتی مسئلہ ہے اور اجتماعی طور پر ہم صرف پاکستانی ہیں۔ اجتماعی طور پر، ایک قوم کی حیثیت سے، ہمیں دین سے کوئی غرض نہیں۔ ہم دنیاداری کے اصولوں پر چل کر قوم کو معاشی ترقی کی راہ پر لگائیں گے، جیسے دین غربت کی ہی راہ دکھاتا ہو۔ فرق صرف اتنا ہے کہ دین میں پیسہ کمانے کے کچھ اصول ہیں۔ کچھ چیزیں ایسی ہیں جو بکاؤ نہیں۔ دنیاداری کے اصولوں کے مطابق تو پیسہ ہی خدا ہے اور کیونکہ ہم سمجھتے ہیں کہ رزق براستہ امریکہ آتا ہے، اس لیے قوم کا سجدہ واشنگٹن کو ہوگا۔ پھر قاعدہ یہ ٹھہرا کہ آپ انفرادی طور پر بیشک اللہ کو سجدہ کرتے رہیں، حکومت کو کوئی اعتراض نہیں، جب تک آپ ان دو سجدوں کو تصادم کا رنگ دینے کی کوشش نہ کریں۔ پھر یقیناً ان کی نظروں میں امریکہ کی اسلام کے خلاف یہ جنگ ہماری جنگ ہی ہوگی۔ (جاری ہے)

☆☆☆☆☆

لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کا شمار افواج پاکستان کے مایہ ناز، بلند ہمت، باکردار اور اصول پسند افسران میں ہوتا ہے۔ انہیں جس قدر کامیابیاں حاصل ہوئیں، اس کی وجہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر مکمل یقین ہے۔ جہاں کہیں بھی وطن عزیز کے دفاع اور قومی مفادات کا معاملہ سامنے آیا، وہ حکمرانوں کے سامنے بڑی جرأت اور استقامت سے حاضر سروس جنرل ہوتے ہوئے بھی اختلافی رائے پیش کرتے رہے۔ ڈائریکٹر جنرل تجزیاتی ونگ کی حیثیت سے کارگل کے محاذ کے حوالے سے انہوں نے ہمیشہ حقیقت پسندانہ تجزیہ اعلیٰ فوجی حکام کو مہیا کیا۔ نائن الیون (11/9) کے کیلئے فوجی سہولتوں کی فراہمی کے معاملے پر بھی اعلیٰ سطحی فوجی اجلاس میں کھل کر کلمہ حق بلند کیا۔ ان کی ملازمت کا عرصہ فیض کے اس مصرعے کی عملی تفسیر رہا:

جو رکے تو کوہِ گراں تھے ہم، جو چلے تو جاں سے گزر گئے

لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کی اجازت سے، ان کی کتاب "یہ خاموشی کہاں تک" سے منتخب اقتباسات قارئین کی معلومات اور دلچسپی کے لیے پیش کیے جا رہے ہیں۔

قسط نمبر 20

”مشرف مغرب کی نقالی کو ترقی سمجھتے تھے“

سیکولر نظریات کے حامل تھے - انہوں نے واضح کر دیا تھا جو مجھ سے اختلاف کرے گا وہ وفاداروں کے بلند دائرے سے نکل جائے گا - قصیدہ خوانوں میں گھرے رہنا ان کی بڑی غلطی تھی - لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کی کتاب سے اقتباس
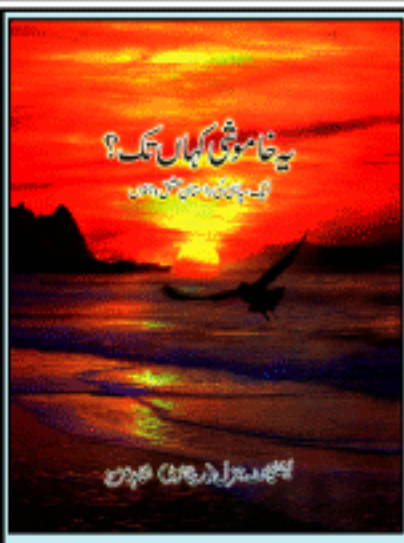
لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کا شمار افواج پاکستان کے مایہ ناز، بلند ہمت، باکردار اور اصول پسند افسران میں ہوتا ہے۔ انہیں جس قدر کامیابیاں حاصل ہوئیں، اس کی وجہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر مکمل یقین ہے۔ جہاں کہیں بھی وطن عزیز کے دفاع اور قومی مفادات کا معاملہ سامنے آیا، وہ حکمرانوں کے سامنے بڑی جرأت اور استقامت سے حاضر سروس جنرل ہوتے ہوئے بھی اختلافی رائے پیش کرتے رہے۔ ڈائریکٹر جنرل تجزیاتی ونگ کی حیثیت سے کارگل کے محاذ کے حوالے سے انہوں نے ہمیشہ حقیقت پسندانہ تجزیہ اعلیٰ فوجی حکام کو مہیا کیا۔ نائن الیون (11/9) کے کیلئے فوجی سہولتوں کی فراہمی کے معاملے پر بھی اعلیٰ سطحی فوجی اجلاس میں کھل کر کلمہ حق بلند کیا۔ ان کی ملازمت کا عرصہ فیض کے اس مصرعے کی عملی تفسیر رہا:

جو رکے تو کوہِ گراں تھے ہم، جو چلے تو جاں سے گزر گئے

لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کی اجازت سے، ان کی کتاب ”یہ خاموشی کہاں تک“ سے منتخب اقتباسات قارئین کی معلومات اور دلچسپی کے لیے پیش کیے جا رہے ہیں۔

میں نے جنرل مشرف کو پاکستان کا وفادار ہی سمجھا۔ میرے دل میں یہ خیال نہیں آیا کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں، اپنی سوچ کے مطابق ملک کی بھلائی کیلئے نہیں کر رہے۔ ایک ملک کا سربراہ ہونے کی حیثیت سے انہوں نے ملک کیلئے جو بہتر سمجھا کیا۔ یقیناً اپنی ذات کو ملک سے اوپر جانا، اور اپنے ذاتی فائدے کو ملک کا مفاد ظاہر کیا، مگر اس سے ہٹ کر تو کسی حکمران سے توقع بھی نہیں رکھتا۔ میں نہیں سمجھتا کہ ہمیں کوئی ایسا حکمران نصیب ہو سکے گا جو خود کو ڈبو لے، لیکن ملک کا مفاد نہ چھوڑے۔ ایسا فرشتہ کہاں سے لائیں گے؟ باتیں آسان ہیں، حقیقت ایسی نہیں ہوتی۔ انہوں نے بہت سی غلطیاں کیں، جن کو وہ کوئی نہ کوئی رنگ دے دیتے، ان کی وجوہات کہیں اور ٹھہراتے، کوئی بھی حکمران اپنی غلطیوں کو نہیں مانتا۔ قصوروار تو کوئی نہیں رہا، نہ فوجی حکمران نہ سیاسی۔ غلطی کا اقرار یہ بھی کبھی نہ کرتے۔ خود کو باصلاحیت حکمران ہی تصور کرتے۔ شاید حکمرانی میں آ کر انسان کی سوچ ایسی ہی ہو جاتی ہو۔

فوج کا سربراہ بننے کے بعد ان کی پہلی غلطی کارگل کا معرکہ تھی۔ بہت بڑی غلطی کی۔ پھر برسوں بعد اپنی کتاب میں اس پر غلط بیانی کی۔ سچ بولنا بھی سیاسی خودکشی ہے۔ اتنے سچ کی بھی میں حکمران سے توقع نہیں رکھتا۔ سیاسی قائدین سے تو ہرگز نہیں۔ حکومتیں ہمیشہ وہی کہتی ہیں جس میں مصلحت اندیشی ہو۔ ان سے بچوں کی طرح کے سچ کی امید نہ رکھیں۔ وہ تو آج کا عام آدمی بھی نہیں بولتا، سیاست دانوں سے ایسی توقع کیوں؟ کچھ نہ کچھ مکاری ہماری سیاست کا حصہ ہے۔ اگر آپ یوں مان لیں کہ ”سب سے پہلے میں، پھر پاکستان“ تو مشرف صاحب اتنے برے بھی نہ تھے۔

کوئی بھی حکمران تمام باتیں تمام لوگوں سے نہیں کہہ سکتا۔ اور میں نے یہی دیکھا کہ اس سطح پر جھوٹ اور سچ کوئی معنی بھی نہیں رکھتے۔ صرف بات مناسبت کی منطق پر کہی جاتی ہے۔ ہماری سیاست میں جھوٹ کو جھوٹ نہیں کہتے، سیاست کہتے ہیں۔ پھر ہماری تاریخ میں سچائی اور لیڈری کا جوڑ کہاں رہا؟ یہ سب خیالی باتیں ہیں، میرے جیسے بے وقوفوں کی ذہنی معذوریاں۔

عام تصور سے ہٹ کر، یہ سمجھنا چاہئے کہ ہر حکمران نہایت خوف زدہ شخص ہوتا ہے۔ وہ اس اونچائی پر بیٹھا ہوتا ہے جہاں سے ذرا سی جنبش اسے گرا سکتی ہے۔ وہ اپنی بلندی برقرار رکھنے کیلئے کسی ہل جل کو پسند نہیں کرتا۔ درخت کا تنا ہی مضبوط ہوتا ہے، قوم کی مڈل کلاس میں سے اونچی ٹہنی، جس پر یہ حکمران چڑھ بیٹھتے ہیں، سب سے کمزور ہوتی ہے۔ غریب عوام جو جڑوں کی طرح زمین میں دھنسے ہیں، اس اونچائی سے انہیں نظر نہیں آتے۔ بھول جاتے ہیں کہ جس شاخ پر بیٹھے ہیں، اس کی ساری طاقت زمین میں دبی جڑوں سے ہی آتی ہے۔ یہی مزدور اور کسان اور سپاہی اس ملک کو اپنے خون پسینے سے بناتے اور اس کا دفاع کرتے ہیں۔ اگر یہ احساس زندہ رہتا تو شاخ سے کبھی نہ گرتے۔

جنرل مشرف نے دو مرتبہ، میری موجودگی میں، فوج کے سینئر افسران کو خطاب کرتے ہوئے وفاداری کی اہمیت پر بات کی۔ کہنے لگے وفاداری کئی قسم کی ہوتی ہے۔ ایک ذاتی وفاداری (Personal loyalty) کہ آپ میرے دوست ہیں اور مجھ سے اس بنا وفادار ہیں۔ اچھی بات ہے۔ دوسری یہ کہ آپ کی وفاداری ادارے کے ساتھ ہے۔ (Institution loyalty) جیسے فوج یا ملک سے وفاداری۔ قابل احترام ہے۔ مگر میں جس وفاداری کی قدر کرتا ہوں، وہ ہے خیالات کی وفاداری (Loyalty of ideas) اگر میری اور آپ کی سوچ ایک ہے تو پھر بے وفائی کی کوئی وجہ نہیں رہتی۔ انہوں نے یہ بات سب پر واضح کر دی کہ اگر کوئی مجھ سے اختلاف کرے گا، تو وہ وفاداروں کے بلند دائرے سے گر جائے گا۔ اس کے بعد اگر لوگوں کو اختلاف بھی ہوتا، تو خاموش رہنا مناسب سمجھتے۔ یہی ان کی منشا تھی۔

چونکہ ان کے روز و شب انہی وفاداروں کے ساتھ گزرتے جو ان جیسی سوچ رکھتے، یا کم از کم ویسی ہی سوچ ظاہر کرتے تو مشرف صاحب اسی سمت میں چلتے رہے۔ یہ ان کی بہت بڑی غلطی تھی۔ متضاد سوچوں کو بھی سننا چاہئے، ذہن ماؤف نہیں ہوتے۔ کٹھ پتلی قصیدہ خوانوں میں گھرے رہے اور ان ہی میں خوشی ڈھونڈی اور تسکین پائی۔ آسانی سے لوگوں کے بہکاووں میں آ جاتے۔ مذہبی رجحان نہیں تھا، سیکولر اور آزاد خیال نظریہ رکھتے تھے فقط دنیاداری کے قائل تھے، اس وجہ سے مغربی طرز پر معاشرے کو ڈھالنا چاہتے تھے۔ وہ اسے ترقی سمجھتے۔ (جاری ہے)

☆☆☆☆☆

قسط نمبر 21

”مشرف خود کو ملک کیلئے ناگزیر سمجھتے تھے“

ان کا خیال تھا وہ ہٹے تو ملک ڈوب جائیگا - افغانستان پر امریکی قبضے کیخلاف اٹھنے والوں کو القاعدہ کا ساتھی اور دہشت گرد کہا جاتا - مشرف مسلمانوں کے قاتل کے طور پر یاد رکھے جائینگے - لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کی کتاب سے اقتباس
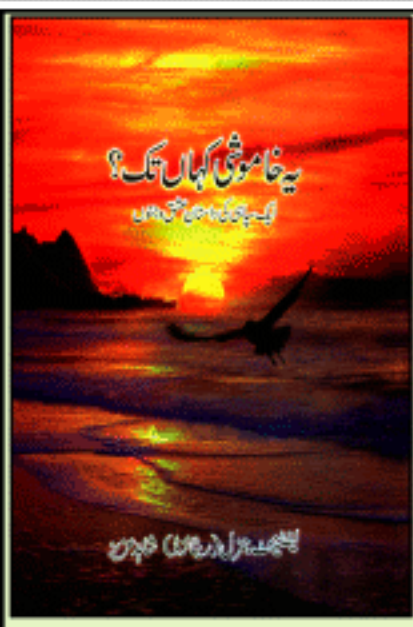
لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کا شمار افواج پاکستان کے مایہ ناز، بلند ہمت، باکردار اور اصول پسند افسران میں ہوتا ہے۔ انہیں جس قدر کامیابیاں حاصل ہوئیں، اس کی وجہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر مکمل یقین ہے۔ جہاں کہیں بھی وطن عزیز کے دفاع اور قومی مفادات کا معاملہ سامنے آیا، وہ حکمرانوں کے سامنے بڑی جرأت اور استقامت سے حاضر سروس جنرل ہوتے ہوئے بھی اختلافی رائے پیش کرتے رہے۔ ڈائریکٹر جنرل تجزیاتی ونگ کی حیثیت سے کارگل کے محاذ کے حوالے سے انہوں نے ہمیشہ حقیقت پسندانہ تجزیہ اعلیٰ فوجی حکام کو مہیا کیا۔ نائن الیون (11/9) کے لئے فوجی سہولتوں کی فراہمی کے معاملے پر بھی اعلیٰ سطحی فوجی اجلاس میں کھل کر کلمہ حق بلند کیا۔ ان کی ملازمت کا عرصہ فیض کے اس مصرعے کی عملی تفسیر رہا:

جو رکے تو کوہِ گراں تھے ہم، جو چلے تو جاں سے گزر گئے

لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کی اجازت سے، ان کی کتاب ”یہ خاموشی کہاں تک“ سے منتخب اقتباسات قارئین کی معلومات اور دلچسپی کے لیے پیش کیے جا رہے ہیں۔

جہاں تک نام نہاد ڈیموکریسی کا تعلق ہے۔ اس پر ویسے ہی نہ میرا اعتقاد تھا اور نہ ہے۔ جنرل مشرف نے نیا شفاف نظام تشکیل دینا تھا، نہیں دیا۔ کیا کوئی پیچیدگیاں تھیں؟ میں کہہ نہیں سکتا۔ مجھے کوئی ایسی مجبوریاں نظر تو نہیں آئیں۔ نظام پر اتنا اعتقاد نہیں رکھتے تھے، نظام چلانے والے پر زیادہ انحصار کرتے۔ اسی لئے نظام کو چھیڑنا غیر ضروری سمجھا، کہ میں سب سنبھال لوں گا۔ پھر ہر ڈکٹیٹر کی طرح وہ بھی یہی سمجھتے تھے اگر وہ منظر سے ہٹ گئے تو ملک ڈوب جائے گا۔ جب نظام درست نہیں کیا، تو یقیناً حکومت ڈوبے گی اور آخر کار ملک بھی۔ پھر ہماری تاریخ کا ہر حکمران اپنی کرسی بچانے کیلئے جو بھی کر سکتا ہے، کرتا ہے۔ تو جب نظام لڑکھڑانے لگا، انہوں نے بھی جو کر سکتے تھے کیا۔ وہ چونکہ زیادہ طاقتور تھے، کچھ زیادہ ہی کر گئے۔

افغانستان پر امریکہ اور اس کے اتحادیوں کا قبضہ تھا۔ جو ان کے خلاف اٹھتا اسے القاعدہ کا ساتھی اور دہشت گرد کہا جاتا۔ دہشت گردی کسے کہتے ہیں، کوئی نہ پوچھتا۔ بس کہہ دیا کہ سیاسی مفاد کی خاطر عوام کو نشانہ بنانا، دہشت گردی ہے۔ اور جو امریکہ اپنے مفاد کی خاطر افغانستان کے بے گناہ شہریوں کا قتل عام کر رہا تھا، اسے دہشت گردی کے خلاف جنگ قرار دیا۔ اور جو افغان اپنی آزادی کیلئے لڑ رہے تھے، وہ دہشت گرد ٹھہرے۔ امریکہ کا ساتھ دینے والے مسلمان ہوش مند کہلائے۔ اس سے اختلاف رکھنے والے جاہل، شدت پسند۔ جیسے ہماری تاریخ کا ہر فوجی حکمران ایک بڑے گناہ کا بوجھ لئے کھڑا ہے، مشرف صاحب مسلمانوں کے قاتل کے طور پر یاد کئے جائیں گے۔

یہ احساسات ان دنوں بھی میرے دل میں تھے لیکن میں گنتی کے چند لوگوں میں سے تھا جو امریکہ کا ساتھ دینے کے حق میں نہیں تھے۔ کچھ تو شروع میں تاثر یہ رہا کہ ہم غیر جانبدار ہیں۔ کچھ فرقہ وارانہ دہشت گردی اور شدت پسند رجحانات سے سب ہی خائف تھے۔ میں بھی۔ پھر میرے CGS رہنے کے دوران نہ ہی FATA میں کوئی ایسے بڑے آپریشن شروع ہوئے تھے اور نہ ہی امریکہ کا گھناؤنا کھیل اس طرح کھل کر سامنے آیا تھا۔ ان دنوں جنرل مشرف بھی ملک میں خاصے مقبول تھے۔ میڈیا میں بھی امریکہ کا ساتھ دینے کو ان کی دانائی ہی قرار دیا جاتا۔ کبھی لگتا شاید میرا ہی نظریہ شدت پسندی کی طرف مائل ہے۔

2010ء تک تو ٹی وی چینلز پر بھی امریکہ کے اتحادی ہونے پر کوئی آواز نہیں اٹھتی تھی۔ آج بھی بہت سے لوگ یہی سوچ رکھتے ہیں کہ ہماری بقا امریکہ کی پالیسیوں پر چلنے میں ہی ہے۔ بس ڈرون حملوں، ہماری چوکیوں پر فضائی حملوں اور بلیک واٹر جیسی نجی سیکورٹی کمپنیوں کی آڑ میں ان کی خفیہ ایجنسیوں کی کارروائیوں پر کچھ تشویش ہے۔ وہ بھی اب شروع ہوئی ہے۔ افغانستان میں ان کا اتحادی ہونے پر یا کشمیر کو خیر آباد کہہ کر ہندوستان سے کاروباری مراسم بڑھانے پر آج بھی خاموشی رہتی ہے۔ میرے بارے میں کچھ لوگوں کو خدشہ تھا کہ کہیں 2004ء کی پروموشن میں جنرل نہ بن جاؤں اور ان کو موقع نہ ملے۔ میرے خلاف پروپیگنڈا بھی ہوتا رہا، کچھ سازشیں بھی۔ مگر میں ان سب چیزوں سے دور ہٹنا چاہتا تھا۔ اگر مجھے ترقی کی اتنی خواہش ہوتی تو میرے لئے صدر صاحب کی ہاں میں ہاں ملانا کوئی ایسا کٹھن مسئلہ تو تھا نہیں۔ سب ہی کر رہے تھے۔ پھر بہت سے دوست مجھے بھی یہی سمجھاتے رہے۔ مگر میں ہی ہر جگہ الجھتا رہتا۔ ترقی کی خواہش کوئی انوکھی بات نہیں۔ مگر اس ماحول میں مجھے مزید پروموشن لینے کی آرزو نہیں رہی تھی۔ پھر یہ طور طریقے میری طبیعت کو کبھی موافق نہیں آئے۔ جب وہ کور کمانڈر منگلا تھے تو ان سے میری پہلی ملاقات ہوئی۔ میری تایا زاد بہن کی بیٹی کی منگنی ان کے بیٹے سے ہوئی۔ ان دنوں میں MO میں بریگیڈیئر تھا۔ اس سے پہلے ہم ایک دوسرے سے واقف نہیں تھے۔ اس شادی سے ہماری رشتہ داری ہوئی۔ پھر فوجی حکومت قائم کرنے میں میرا خاصہ کردار رہا تھا۔ اپنے ہاتھ سے بنائی عمارت کی اینٹیں اکھیڑنا بھی عجیب سا لگتا ہے۔ جیسے بے وفائی کی حد چھو لی ہو۔ ہمارا ایک دوسرے کے گھروں میں بھی آنا جانا رہتا، لیکن ایسے موقعوں پر کوئی سرکاری بات نہ ہوتی۔ وہ ہمیشہ مجھ سے بہت محبت سے پیش آتے۔ لیکن میں نے کبھی ان مراسم کا فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی۔ جن دنوں میں CGS تھا، میجر جنرل طارق مجید صاحب MI کے سربراہ تھے۔ (بعد میں جنرل بنے اور چیئرمین جوائنٹ چیف آف اسٹاف کمیٹی نامزد ہوئے) ایک دن مجھے بتایا کہ جنرل مشرف نے ان سے کہا تھا کہ فوج سے ذرا تخمینہ (Pulse) لیں، کہ لوگ کس کو وائس چیف کے عہدے پر دیکھنا پسند کریں گے۔ کہنے لگے ”آپ جانتے ہیں فوج میں کیا سوچ ہے؟ تقریباً متفقہ (unanimous) خیال ہے کہ آپ کو وائس چیف ہونا چاہئے“۔ یہ اللہ کا مجھ پر بہت بڑا کرم تھا کہ اس نے مجھے عزت دی۔ مگر وائس چیف کے عہدے پر رہ کر میرے لئے اپنے چیف کے ساتھ کام کرنا نہایت دشوار ہو جاتا، اور ان کے لئے بھی۔ یقیناً یہ فوج کے نظم وضبط کیلئے مناسب نہیں تھا کہ چیف اور وائس چیف میں تنازع رہے۔ وفاداریوں کا مسئلہ بھی اٹھ جاتا۔ یہ مجھے قبول نہیں تھا۔ فوج جیسے اہم ادارے کو باہمی جھگڑوں میں نہیں الجھایا جا سکتا۔ ان حالات میں، اس طرح ملک تباہ ہو سکتا تھا۔ میرے لاہور جانے سے پہلے ایک مرتبہ میجر جنرل ندیم تاج (بعد میں لیفٹیننٹ جنرل بنے۔ اور ISI کے سربراہ رہے)، جو ان دنوں چیف کے پرسنل اسٹاف افسر تھے، کہنے لگے کہ وائس چیف کے عہدے پر پروموشن کیلئے آپ کا نام بھی لیا جا رہا ہے۔ میں نے کہا کہ چیف کو ایسا مشورہ ہرگز نہ دیں، کیونکہ میں اس عہدے کیلئے موزوں نہیں ہوں۔ ایک تو کئی افسر مجھ سے سینئر ہیں، دوسرے میری ان سے رشتہ داری بھی ہے اور پھر وہ خود بھی مہاجر خاندان سے ہیں اور میں بھی، جب کہ فوج زیادہ تر پنجاب سے ہے۔ مجھے پروموٹ کرنا ان کے حق میں بہتر نہیں ہوگا۔ ایسا تاثر قائم ہوگا کہ فوج میں زیادہ تر لوگ ان کے طرف دار نہیں۔ پھر جب دسمبر 2003ء میں، میں یہاں سے تبدیل ہو کر لاہور جانے لگا تو انہوں نے مجھے اور انجم کو اپنے گھر چائے پر بلایا۔ باتوں باتوں میں پوچھنے لگے کہ تمہارا کیا مشورہ ہے، کس کو وائس چیف بناؤں؟ کچھ نام لئے اور وجوہات بتائیں کہ ان کو نہیں بنا سکتا۔ میں نے کہا پھر آپ کے پاس سب سے موزوں انتخاب لیفٹیننٹ جنرل احسن سلیم حیات کا ہے، انہیں بنا دیں۔ میں نے کوئی ایسی جھلک بھی نہیں دی، جس سے ان کو یہ غلط فہمی ہو کہ میں بھی امیدوار ہوں۔ یہ باتیں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ بعد میں ان کو ایک نیا رنگ دیا گیا۔ (جاری ہے)

☆☆☆☆☆

قسط نمبر 22

دلبرداشتہ ہوکر کئی بار استعفیٰ دینے کا سوچا

یہ خیال حاوی رہا کہ استعفیٰ دیکر ہیرو تو بن جاؤں گا لیکن حالات میں کوئی تبدیلی نہیں آئیگی۔ یہ بھی سوچتا کہ فوج مشرف کی ہے اور نہ میں ان کا ذاتی ملازم۔ مجھے اپنا کام کرتے رہنا چاہئے۔ لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کی کتاب سے اقتباس
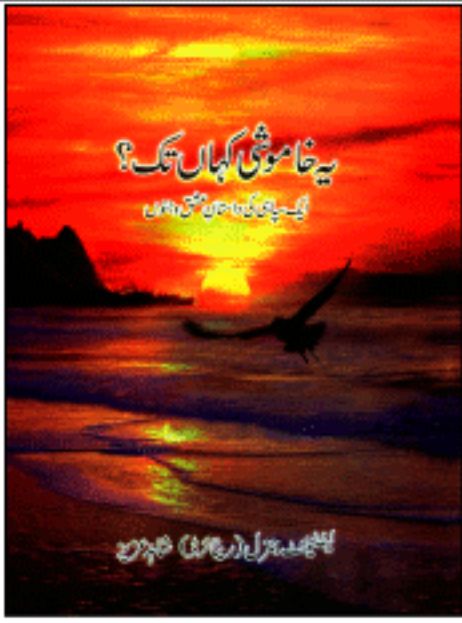
لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کا شمار افواج پاکستان کے مایہ ناز، بلند ہمت، باکردار اور اصول پسند افسران میں ہوتا ہے۔ انہیں جس قدر کامیابیاں حاصل ہوئیں، اس کی وجہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر مکمل یقین ہے۔ جہاں کہیں بھی وطن عزیز کے دفاع اور قومی مفادات کا معاملہ سامنے آیا، وہ حکمرانوں کے سامنے بڑی جرأت اور استقامت سے حاضر سروس جنرل ہوتے ہوئے بھی اختلافی رائے پیش کرتے رہے۔ ڈائریکٹر جنرل تجزیاتی ونگ کی حیثیت سے کارگل کے محاذ کے حوالے سے انہوں نے ہمیشہ حقیقت پسندانہ تجزیہ اعلیٰ فوجی حکام کو مہیا کیا۔ نائن الیون (9/11) کے لئے فوجی سہولتوں کی فراہمی کے معاملے پر بھی اعلیٰ سطحی فوجی اجلاس میں کھل کر کلمہ حق بلند کیا۔ ان کی ملازمت کا عرصہ فیض کے اس مصرعے کی عملی تفسیر رہا:

جو رکے تو کوہِ گراں تھے ہم، جو چلے تو جاں سے گزر گئے

لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کی اجازت سے، ان کی کتاب ''یہ خاموشی کہاں تک'' سے منتخب اقتباسات قارئین کی معلومات اور دلچسپی کے لیے پیش کیے جارہے ہیں۔

سی جی ایس کے دو سال کا عرصہ ذہنی کوفت کا گزرا۔ یقیناً جنرل مشرف کے مقاصد اور طور طریقوں سے مجھے اختلاف رہا اور جو کہہ سکتا تھا کہہ دیتا، کبھی ضمیر کے برخلاف ہاں میں ہاں نہیں ملائی، مگر دل پر ہر وقت ایک بوجھ سا رہتا۔ جی ایچ کیو کے آخری ایام میں ایک دن دفتر میں بیٹھا تھا، سامنے لان میں، سردیوں کی گرم دھوپ میں، مالی گلابوں کی کٹائی کر رہا تھا۔ کچھ دیر بیٹھا کھڑکی سے اُسے دیکھتا رہا۔ دل میں خیال آیا کہ اس کی زندگی کتنی پُرسکون ہے، کاش، میرا بھی اتنا سہل کوئی کام ہوتا جو دل و دماغ پر بوجھ نہ بنتا، دل کو یوں نہ مروڑتا، بس مالی جیسی تنگدستی مجھے نہ ملتی۔ کہتے ہیں کوئی لمحہ ایسا ہوتا ہے جب دل سے نکلی بات پوری ہو جاتی ہے۔ آج پانچ سال سے یہی کر رہا ہوں۔ مگر دل جب بجھ چکا ہو، اُسے کیسے بہلاؤں؟

اپنی ندامت میں اللہ کو بہت قریب پاتا۔ ہر وقت اُس کے خیال سے دل ڈوبا رہتا۔ اس کی محبت ڈھونڈتا اور خود کو اس قابل نہ پا کر بہت پریشان اور پشیمان رہتا۔ کس سے کہتا؟ وہی ایک سننے والا تھا۔ اُسی کو پکارتا، کوئی جواب نہ پاتا۔ کبھی پرانے فلمی گیت سنتا تو اُن میں بھی اللہ کو پاتا، روتا۔ ان ہی دنوں، جب افغانستان پر امریکہ کے گولے پھٹ رہے تھے اور ہم ان کے طاقتور بھائی، اپنی لالچ سمیٹے، دشمن کی گود میں بیٹھے تھے، ایک دوست نے شاہنواز زیدی صاحب کی کتاب ''آئینہ دار'' مجھے دی۔ منظوم پیش لفظ میں لکھا تھا:

میں نابینا مصور ہوں
جو دونوں ہاتھ آگے کرکے چلتا ہے
جو خوابوں میں بھی جا کر بند گلیوں میں نکلتا ہے
کہ اُجلے منظروں کی دوسری جانب جو اندھے غار ہیں
اُن میں مری آنکھیں لڑھکتی ہیں!

ان کے الفاظ میں دل ڈوب کے رہ گیا۔ پھر نظم ''مزار شریف'' پڑھنی شروع کی۔ تصویر کشی ایسی تھی جیسے آنکھوں کے سامنے آئینے میں منظر بکھرا ہو۔ جب آخری سطور پر پہنچا، آئینے میں اپنی شکل دکھائی دی،

''اب کی بار ابابیلوں نے
پھر آنے میں دیر لگادی!''

تو پھوٹ پڑا۔ کمرے میں کچھ اور گھر والے بھی بیٹھے تھے۔ اُٹھ کر غسل خانے میں جا چھپا۔ دیر تک روتا رہا۔ رات بھر یوں ہی گزری۔

دوسرے دن چھٹی تھی۔ ناشتے کی میز پر سب ہی بیٹھے تھے، پرنانا بھی، نانا بھی، میرے بچے بھی اور نواسہ بھی۔ ناشتے کے بعد نہ جانے کیوں میرے منہ سے نکلا کہ جب ریٹائر ہو جاؤں گا تو اللہ میاں کو سیلوٹ کروں گا اور کہوں گا ''میرے لیے کیا حکم ہے؟''۔ وہ کہے گا ''جب تجھے اتنا بڑا افسر بنایا، تب کہاں تھا؟ اب کوڑے کی ٹوکری سے نکل کر کیا پوچھتا ہے کہ کیا حکم ہے؟'' یہ کہتے ہوئے پھر سے آنکھیں بھر آئیں اور وہاں سے ہٹ گیا، مگر سب نے دیکھ لیا تھا۔ ان دنوں کچھ دوستوں سے اس سلسلے میں بات بھی ہوتی۔ سب فوجی ہی تھے۔ سب یہی کہتے کہ میری سوچ ٹھیک نہیں۔ ایک جنرل صاحب نے کہا کہ قائداعظم کون سے اتنے مذہبی انسان تھے، مگر اللہ نے ان سے کتنا بڑا کام لیا۔ یہ اللہ کے اپنے طریقے ہوتے ہیں۔ اللہ ہی نے مشرف صاحب کو بھی اس کرسی پر فائز کیا ہے تو کیا تم اللہ سے ناراض ہو؟ پھر اپنی ذہنی پریشانیوں کو دور کرنے، ان ہی احباب کی رہنمائی میں، کچھ ایسے لوگوں سے بھی رابطہ رہا جو مرید تھے اُن کے، جنہیں ولی اللہ کا رتبہ دیا جاتا تھا۔ یہ تمام مشرف صاحب کی شدت سے حمایت کرتے۔ میں ان میں سے کسی سے منسلک تو نہیں رہا، مگر اُن کی باتوں کا اثر یقیناً مجھ پر رہا۔ پھر ریٹائرمنٹ کے بعد جب ان سے ملا تو کچھ ایسی باتیں ہوئیں اور 2006ء کے حج کے دوران کچھ ایسے واقعات پیش آئے کہ میں اس راہ سے ہٹ گیا۔ کئی بار دل میں خیال اُبھرا کہ فوج چھوڑ دوں، مگر میری منطقوں نے اس خیال کو دبا دیا۔ والد صاحب نے بھی فوج سے استعفیٰ دیا تھا، اس کے بعد بری معاشی حالت سے گزرے۔ دو مرتبہ میں بھی ایسا کر چکا تھا۔ اگر اللہ نے نہ بچایا ہوتا تو نہ جانے بچوں کا پیٹ کیسے پالتا۔ کبھی یہ خیال آتا کہ میں استعفیٰ دے کر ہیرو تو بن جاؤں گا لیکن کسی چیز پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ کچھ بدلے گا تو نہیں۔ میرے رہنے سے ان چیزوں میں کچھ رکاوٹ تو ہے۔ 1971ء کے حالات میں مشرقی پاکستان میں جنرل صاحبزادہ یعقوب خان کے بارے میں بھی خیال آیا۔ انہوں نے بہت اعلیٰ کردار کا مظاہرہ کیا تھا اور غلط لوگوں کا ساتھ چھوڑ دیا، استعفیٰ دے دیا۔ مگر حالات اور بگڑ گئے۔ کبھی یہ سوچتا کہ فوج مشرف کی تو نہیں، میں اُن کا ذاتی ملازم تو نہیں کہ چھوڑ دوں۔ فوج کیلئے کام کرتا ہوں اور کرتے رہنا چاہئے، بولتے رہنا چاہئے۔ یہی میری فوج سے وفاداری ہے۔ خود تو کوئی غلط کام کرنے کی مجبوری نہیں اور نہ ہی کیا۔ جو برا سمجھتا ہوں اسے روکوں گا۔ اس کی دنیادار پالیسیوں سے اختلاف ضرور ہے اور کرتا رہوں گا۔ میں چپ تو نہیں رہتا۔ چلا گیا تو فوج کو کیا ملے گا۔ پھر کبھی خیال آتا کہ آخر میں ہی اتنا ناراض کیوں ہوں، باقی سب تو اطمینان سے ہیں۔ کیا میں نے کہانیوں کے کردار ڈان کویوٹے (Don Quixote) کی طرح اپنے مدمقابل تصوراتی حریف کھڑے کر لیے ہیں، کیا میرا ناتا حقیقت سے کٹ گیا ہے؟ کبھی سوچتا کہ اگر چھوڑ کر چلا گیا تو شاید اللہ ناراض ہو جائے کہ تمہیں دو بار بھاگنے سے بچایا کہ تم سے کچھ کام لینا تھا اور آج وقت آیا تو تم چھوڑ بھاگے۔ سوچا شاید آگے کچھ ہونا ہو، میرا کوئی کام ہو جو مجھے ابھی نظر نہیں آتا۔ دل میں ایک کشمکش چلتی رہی۔ خود فریبیوں میں ڈوبا رہا۔ ایسا کچھ بھی نہ ہوا کہ میں کچھ کرتا۔ خود کو ضائع ہی کیا۔ (جاری ہے)

☆☆☆☆☆

اتوار 24 فروری 2013ء

قسط نمبر 23

روزنامہ امت کراچی/حیدرآباد

مشرف نے نیب کو اپنے ساتھیوں کے خلاف کارروائی سے روک دیا تھا

حکومت غیر مستحکم ہونے کے خطرے پر چھیڑ چھاڑ نہیں چاہتے تھے-نیب میں بھی شفافیت نہیں تھی-میں نے ہر ہفتے کانفرنس کے ذریعے کیسوں کے فیصلے شروع کئے-جن کی ویڈیو ریکارڈنگ کی جاتی تھی-لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کی کتاب سے اقتباس
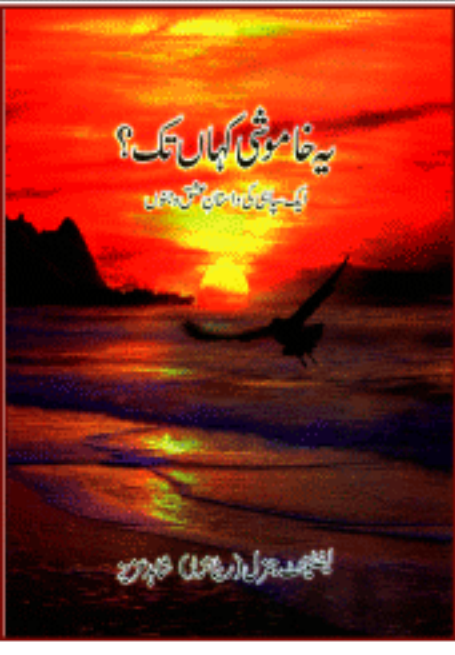
ریٹائرمنٹ کے بعد اکتوبر 2005ء میں ہم راولپنڈی میں اپنی بیٹی کے گھر آ گئے، کوئی اور ٹھکانا تو تھا نہیں۔ اپنا گھر ابھی بن رہا تھا۔ دوسرے ہی دن مجھے صدر صاحب نے اپنے دفتر بلوا لیا۔ کہنے لگے تم قومی احتساب بیورو (NAB) کو سنبھال لو۔ ہماری لاہور کی گفتگو کو فارمل (formal) نوعیت دی، اور کہا، ''مجھے تم سے صرف ایک بات کہنی ہے۔ میری حکومت میں کچھ ایسے لوگ ہیں، مثلاً فیصل صالح حیات صاحب، جن کی کرپشن کے کچھ پرانے قصے ہیں۔ تم ان پرانے قصوں کو فی الحال نہ چھیڑو، میری حکومت غیر مستحکم ہو جائے گی، ملک کا مالی دیوالیہ نکل جائے گا۔ اگلے سال الیکشن ہیں، اس کے بعد دیکھ لینا''۔ میں نے یہی مناسب سمجھا اور حامی بھر لی۔ گنتی کے چند ہی تو لوگ تھے، جن کے پرانے قصے تھے، میرے ذہن میں صرف تین یا چار نام آئے۔ اور صرف پرانے قصے ہی چھوڑنے تھے، اب مزید گڑبڑ کی گنجائش تو دینی نہیں تھی۔ پھر ایک سال ہی کی تو چھوٹ تھی، اگلے الیکشن کے لئے تو ویسے بھی ان کا وعدہ تھا کہ صرف صاف لوگ آگے آئیں گے۔ ملک میں اتنے بڑے پیمانے پر کرپشن ہو رہی تھی، میں نے سوچا، جو کر سکتا ہوں اتنا تو کروں۔

ملک میں پھیلی ہوئی کرپشن کا نہ کوئی تخمینہ ہے اور نہ صحیح طور پر اسے معلوم کرنے کے لئے کوئی ریسرچ کی گئی ہے۔ بس سطحی سی کتابی باتیں ہیں۔ میرے یہاں آنے سے پہلے ایک اینٹی کرپشن اسٹریٹجی بنائی گئی تھی، جسے کیبنٹ نے منظور کیا تھا، مگر اس پر کوئی عمل نہیں ہوتا تھا۔ نہ ہی کوئی کسی کو پوچھتا۔ صرف سیاسی دکھلاوے کے طور پر اس کا ڈھنڈورا پیٹا جاتا۔ NAB چٹھیاں لکھتی رہتی، معاملات جوں کے توں رہتے۔ حکومت کے تمام محکموں کا اینٹی کرپشن کے ہر سلسلے پر ٹال مٹول کا رویہ رہتا۔ مثال کے طور پر، اس پالیسی کے تحت ایک پبلک پروکیورمنٹ ریگولیٹری اتھارٹی (Public Procurement Regulatory Authority) قائم کی گئی، جس کے ابتدائی قانون میں، NAB کے اصرار پر، یہ لکھا گیا کہ ان قوانین پر عمل درآمد نہ کرنا جرم قرار پائے گا۔ پھر جب یہ قوانین آخری شکل میں آئے تو لکھا تھا، ''ان قوانین پر عمل درآمد نہ کرنا کوئی جرم نہیں ہوگا''۔ عجب تماشا تھا۔ بڑی مشکل سے اس لائن کو کٹوایا گیا۔ آج بھی اس قانون پر عمل کرنا لازم نہیں۔ یہ کرپشن کی روک تھام کی جانب حکومت کے عہدیداروں کا رویہ ہے۔ کہتے تھے آپ گورننس کو نہیں سمجھتے، مداخلت سے ملک کا نظام درہم برہم ہوگا۔

جب NAB میں پہنچا تو کچھ دن تو حالات کا جائزہ لیا۔ تمام صوبوں کے دفاتر گیا۔ سب کے تاثرات سنے اور ادارے کی ترجیحات اور کارروائی کے طریقوں میں کچھ ترامیم مناسب سمجھیں۔ چونکہ کرپشن بہت وسیع پیمانے پر ہو رہی تھی، اسے ختم کرنے کی کوشش بھی اس ہی طرح پھیل چکی تھی۔ ہزار فائلیں کھلی ہوئی تھیں، اور تفتیش برسوں چلتی رہتی۔ اتنے زیادہ کیس کھل چکے تھے کہ کئی ڈائریکٹر کے درجے کے لوگ بھی براہ راست تفتیشوں میں مصروف تھے۔ جس کسی کی شکایت آتی، ایک نیا کیس کھل جاتا۔ پھر وہ برسوں سولی پر لٹکا رہتا۔ اس قدر کرپشن کے معاملات زیر تفتیش تھے کہ اس تنظیم کے بس میں نہ تھا کہ ان کو سنبھال سکتی۔ کوئی ترجیحات نہیں تھیں، جس کی چاہے فائل اوپر کر دو، جس کی چاہے دبی پڑی رہے۔ کام کی زیادتی ہر چیز پر اپنا رنگ چھوڑتی۔

اس پھیلے ہوئے کام کو قابو میں کرنے کے لئے، میں نے اپنی ایک کانفرنس میں کہا کہ توجہ شیاطین پر مرکوز رکھیں، گناہ گاروں پر نہیں۔ یہ اس سلسلے میں بھی کہا کہ ایک سابقہ وزیر کا کیس تھا، جن پر الزام تھا کہ انہوں نے کچھ سرکاری گاڑیاں اپنی زمینوں پر استعمال کے لئے رکھی تھیں۔ شاید کل چار یا چھ لاکھ روپے کے خورد برد کا معاملہ تھا۔ میں نے کہا کہ اگر آج کل کے ماحول میں کوئی وزیر صرف گاڑی ہی ناجائز استعمال کر رہا ہے اور اس کے خلاف اس کے علاوہ کوئی شکایت نہیں، تو اس سے زیادہ صاف ستھرا وزیر آپ کو کہاں سے ملے گا؟ ملک میں بہت بڑے پیمانے پر کرپشن ہو رہی ہے، چھوٹے چھوٹے مسئلوں میں الجھنا بے مقصد ہے۔

NAB کے اعلیٰ عہدیداران سے مشاورت کے بعد، ادارے کی کارروائیوں میں چند ترامیم کیں۔ یہ تو ظاہر تھا کہ اگر حکومت کے کارندے کرپٹ ہوں تو ایک شہری کے لئے، جو ان سے کوئی واسطہ رکھے، کرپشن سے بچنا ممکن نہیں، ورنہ اس کا کوئی کاروبار چل نہیں سکتا۔ فیصلہ یہ ہوا کہ ہمارا فوکس (focus) بالعموم حکومت کی مشینری پر ہی رہنا چاہئے۔ عام شہریوں کے صرف وہ کیس دیکھے جائیں، جہاں مجموعی طور پر عوام کو لوٹا گیا ہو، یا بہت بڑے پیمانے پر پیسے کا غبن ہوا ہو۔ یہ بھی فیصلہ کیا کہ حکومت کے عہدیدار چوری کا پیسہ لوٹا کر کیس ختم نہیں کروا سکیں گے۔ انہیں لامحالا سزا کے لئے کورٹ میں لے جایا جائے گا۔ اس فیصلے سے کافی حد تک کام سنبھل گیا۔

ایک حد بھی لگائی کہ ایک تفتیشی ٹیم ایک وقت میں کتنے کیس دیکھ سکتی ہے۔ ساتھ ہی تفتیشی ٹیم کے لئے وقت بھی مقرر کر دیا گیا کہ اتنے عرصے میں تفتیش مکمل کر لے۔ یہ اس لئے ضروری تھا کہ جس کسی پر الزام ہو، وہ برسوں ہوا میں نہ لٹکا رہے۔ پھر کچھ ترجیحات متعین کیں، جن کے مطابق یہ فیصلہ کیا جا سکے کہ کون سے کیس کی تفتیش شروع کی جائے۔ پہلی ترجیح پر حکومت کے بڑے عہدیداران تھے، پھر وہ لوگ جنہوں نے بڑے پیمانے پر عوام کو لوٹا ہو۔ عہدے اور چوری کے الزام کے حجم کو مدنظر رکھتے ہوئے پندرہ یا بیس ترجیحات کی ایک لسٹ تیار کی اور تمام دفاتر کو بھجوا دی گئی۔ ایک مخصوص تعداد میں کیسوں کی ایک وقت میں تفتیش ہو سکتی تھی اور قطعی طور پر ان ہی ترجیحات کے مطابق، جب گنجائش ہو۔ پھر کوئی نیا کیس اس ترجیح کے مطابق کھولا جائے۔ اگر دیئے ہوئے عرصے میں کوئی تفتیش مکمل نہ کی جا سکتی، تو تفتیشی افسر اور اس کے بالا عہدیداروں کو اس کی وجوہات لکھ کر بیان کرنا پڑتیں۔

NAB حکومت میں شفاف کارکردگی (transparency) چاہتا تھا، تاکہ حکومت کے سب کام شفاف نظر آئیں۔ بذات خود NAB کے کاموں میں اتنی ٹرانسپیرنسی نہیں تھی۔ میں نے یہ لازم سمجھا کہ ہمارے دفتروں میں بھی ہر کام شفاف ہو، تاکہ NAB کے ادارے کے اندر کرپشن کی گنجائش کم سے کم رہ جائے، اور عوام اس ادارے پر بھروسہ کر سکیں۔ پہلا فیصلہ تو یہ کیا کہ اپنے دفتر میں فائلوں پر فیصلے دینے بند کر دیئے۔ ایک ہفتہ وار کانفرنس منعقد کرانی شروع کی، جس کا نام ایگزیکٹو بورڈ (Executive Board) رکھا۔ اس میں کیسوں سے منسلک تمام عہدیداران شامل ہوتے۔ عموماً ان کانفرنسوں میں بیس سے زیادہ لوگ ہوتے۔ تفتیشی ٹیمیں، پراسیکیوٹر (Prosecutor)، ان سے اوپر کے ہر سطح کے عہدیدار، قانونی ماہرین، ڈپٹی چیئرمین اور پراسیکیوٹر جنرل اکاؤنٹیبلٹی (PGA,Prosecutor General Accountability) سب ہی اس کی میٹنگ میں بیٹھتے۔ اس بورڈ کے سامنے کیس پیش کیا جاتا، تمام اس پر اپنی رائے کا اظہار کرتے اور مشاورت کے بعد یہیں پر میں فیصلہ سناتا اور اس پر دستخط کرتا۔ چاہے کوئی کیس کھولنا ہو، بند کرنا ہو، اسے کورٹ میں لے جانا ہو یا اس سے منسلک کوئی معاملہ ہو، یہیں اس پر فیصلہ کیا جاتا۔ یہ سارا سلسلہ ویڈیو ریکارڈ ہوتا، تاکہ آئندہ کے لئے ریکارڈ رہے۔ NAB کے ہر صوبائی دفتر میں بھی اسی طرح کا سلسلہ جاری ہوا۔ ایک طاقتور ادارے کی طاقت کو لگام نہ ڈالی جائے، تو وہ عوام کے لئے خاصی پریشانیوں کا باعث بن سکتا ہے۔

☆☆☆☆☆

قسط نمبر 24

'نیب میں بینکوں کا رسوخ ختم کرنے میں شوکت عزیز رکاوٹ تھے'

بینک افسران نے مالیاتی معاملات سنبھال رکھے تھے جس سے بینکوں کو تحفظ ملتا-وزارت صحت کے محکموں کی تطہیر کرنے پر ہلچل مچ گئی-لیکن یہ کام بھی نیب سے ہٹائے جانے کے سبب مکمل نہ ہو سکا-لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کی کتاب سے اقتباس

نیب سربراہ بننے کے بعد نیب کے دفاتر میں لوگوں کا آنا جانا بند کیا۔ تفتیش کیلئے علیحدہ کمروں کا استعمال شروع کیا۔ NAB کے کم ازکم تین عہدیداران تفتیش کیلئے موجود ہوتے۔ ان کمروں میں ویڈیو کیمرے نصب کئے گئے اور تفتیش کا باقاعدہ ویڈیو ریکارڈ رکھا جاتا۔ تمام دفاتر کو کمپیوٹر کے نظام سے آراستہ کیا۔ تفتیش روز کمپیوٹر پر چڑھائی ہوتی اور پھر تبدیل نہ کی جاسکتی۔ اس طرح سے ہر کام کی پیش رفت پر روز بروز نظر بھی رکھی جاسکتی۔ نیب کے کسی افسر کی کرپشن کو بے نقاب کرنے والے کیلئے دس لاکھ روپے کا انعام بھی رکھا۔

ان ملاقاتیوں کیلئے جو کسی کیس کے سلسلے میں مجھ سے ملنے آتے، ایک علیحدہ کمرا بنوایا۔ اس کمرے کی ہر میٹنگ کی بھی ویڈیو ریکارڈ ہوتی۔ کچھ لوگوں کو یوں بھی پریشانی تھی کہ انہیں نیب میں بلوالیا جاتا اور گھنٹوں بٹھائے رکھتے، کوئی پوچھنے والا نہ ہوتا۔ اس کا بھی باضابطہ طریقہ بنا دیا۔ NAB کی حراست (arrest) میں لینے کی طاقت کو سختی سے محدود کردیا، کہ کہیں چھوٹی چھوٹی چیزوں پر لوگوں کو حراست میں لے کر بدنام نہ کیا جائے۔ جن لوگوں کی تفتیش ہو رہی ہو اور ان کی جائیداد منجمد کی گئی ہو، انہیں ان کے جائز گھریلو اخراجات کیلئے رقم نکلوانے کی اجازت دی، تاکہ گھر والے فاقوں پر نہ آجائیں۔ جب کورٹ فیصلہ سنادے، پھر چاہے اس کی ساری جائیداد ضبط ہوجائے۔ کوشش کی کہ ملزموں کے ساتھ مجرموں جیسا برتاؤ نہ ہو۔ یہ بھی لازم کیا کہ کسی ملزم کا نام اس وقت تک باہر نہ نکلے، جب تک اس کا کیس کورٹ میں نہ پہنچ جائے۔ پھر چاہے کورٹ سے یہ نام نکلے، NAB سے نہ نکلے۔ اسی قسم کی اور کئی چھوٹی چھوٹی چیزیں کی گئیں، جن سے NAB کی کارکردگی بہتر ہوسکے اور قوم کا اس اہم ادارے پر اعتماد قائم ہوسکے۔

یہ درست ہے کہ میرے آنے سے پہلے NAB میں انتخابی (selective) کام بھی ہوتا تھا۔ مگر یوں نہیں تھا کہ کسی پر خوانخواہ کا الزام لگایا جاتا۔ سیاسی مفاد کی خاطر کیس کھولے یا بند ضرور کئے جاتے رہے تھے، مگر ان میں کچھ ہوتا ضرور تھا۔ اگر کہیں غلط کیس بنا ہوگا، تو ہوسکتا ہے غلطی ہوئی ہو، یا یوں کہیں کہ پورے شواہد نہ مل سکے ہوں گے۔ لیکن میں نہیں سمجھتا کہ کبھی بدنیتی سے غلط کیس بنایا ہوگا۔ الیکشن میں NAB کا استعمال رہا ہوگا، کہہ نہیں سکتا۔ ایک مرتبہ کہیں چند سیٹوں پر انتخاب ہوئے۔ مجھ پر کافی زور ڈالا گیا، کسی کا کیس بند کرنے کیلئے اور کسی کا دوبارہ کھولنے کیلئے۔ لیکن میں نے سختی سے اس کھیل میں حصہ لینے سے انکار کردیا۔

NAB میں مالیاتی معاملات کو دیکھنے کیلئے بینکوں کے ملازمین کام کرتے تھے۔ یہ افسران اپنے بینکوں سے تنخواہ اور دیگر مراعات پاتے اور NAB میں اپنا عرصہ پورا کرنے کے بعد واپس بینکوں میں چلے جاتے۔ اس طریقے سے بینکوں کا اثر و رسوخ NAB پر قائم تھا اور بینکوں کو خاصا تحفظ حاصل تھا۔ میں اس ناجائز سلسلے کو ختم کرنے پر لگا تھا، لیکن پورا نہ کرپایا اور NAB سے نکلنا پڑا۔ اس کو ختم کرنے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہمارے وزیراعظم شوکت عزیز صاحب تھے جو بینکوں کو اوٹ فراہم کرنے میں پیش پیش رہتے۔ وہ NAB کو اتنے پیسے دینے پر آمادہ نہیں تھے کہ ہم ایسے تجربے کار لوگوں کو رکھ سکیں اور بینکوں کے ملازمین کو واپس کرسکیں۔ نہ جانے یہ سلسلہ ختم ہوا یا نہیں۔

کچھ معائنہ ٹیمیں بھی تشکیل دیں، جو اچانک موقع پر پہنچ کر کسی کام کو دیکھ سکیں۔ مثلاً کوئی سڑک یا عمارت سرکار نے بنائی ہو، تو اس سلسلے کے ماہرین کو ساتھ لے کر موقع پر اس کام کی جانچ پڑتال کی جاسکے۔ یا عام شہریوں کی اجتماعی تکلیف کو دور کرسکیں۔ مثلاً ادویات کی فیکٹری کا معائنہ، کھانے پینے کی اشیا تیار کرنے کی فیکٹریوں یا فروخت کرنے کی جگہوں کا معائنہ، جانوروں کی قربانی گاہوں (abattoirs) کی جانچ پڑتال، دیکھنا کہ پٹرول پمپوں پر صحیح قسم کا پٹرول بکتا ہو، وغیرہ وغیرہ۔ ان کارروائیوں سے ظاہر ہے تمام کا تمام تو ٹھیک نہیں ہوسکتا تھا، مگر مقصد یہ تھا کہ معاشرے میں کچھ نہ کچھ پکڑ کا خوف (deterrence) قائم ہوسکے۔

حکومت کے اداروں میں کوئی معاملہ کھلا اور شفاف نہیں ہوتا۔ ہر چیز چھپی ہوئی رکھی جاتی ہے، جیسے کوئی قومی سلامتی کے اہم راز ہوں۔ اسی سے تمام بیماریاں جڑ پکڑتی ہیں۔ اس سلسلے میں NAB کے پریونشن (prevention) ونگ کو مضبوط کیا گیا، اور پہلے ہدف کے طور پر صحت کے محکمے کو چنا گیا۔ ہمارے قوانین میں لکھا تھا کہ NAB حکومتی اداروں کے کام کا جائزہ لے گی اور ایسے طریقے تجویز کرے گی جن کو اپنانے سے ان محکموں کی کارکردگی کو شفاف بنایا جاسکے۔ البتہ قوانین میں ان تجاویز پر عمل کرنا لازم قرار نہیں دیا گیا تھا۔ اس کا فیصلہ وزارتوں پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ میں نے سوچا کہ وزارت صحت کے تمام دفاتر اور محکموں کا جائزہ لیتا ہوں، پھر دیکھوں گا کہ اپنے کام کو شفاف بنانے کیلئے انہیں کیسے آمادہ کیا جائے۔ ہر محکمے میں اتنے ناجائز کام ہو رہے تھے کہ پکڑے جانے کے خوف کی وجہ سے NAB کو آسانی سے ٹالا نہیں جاسکتا تھا۔ جب یہ کام شروع کیا تو وزارت صحت میں خاصی ہل چل مچی، لیکن وہ ہمارے کام کو روک نہ سکے۔ مگر یہ بھی، بہت سے اور کاموں کی طرح، NAB سے جلد نکلنے کی وجہ سے آدھے راستے ہی میں رہ گیا۔ ان میں سے چند ابتدائی ترجیحات کا اعلان NAB کی ویب سائٹ (website) پر جنوری کے مہینے میں کیا گیا۔ کچھ ہی دن بعد ایک اخبار میں خبر چھپی۔ لکھا تھا کہ فیڈرل سیکرٹریوں کی ایک میٹنگ ہوئی، جس میں خدشات کا اظہار کیا گیا کہ اگر سرکاری ملازمین کو NAB سے پناہ نہ دی گئی، تو حکومت کا کام نہیں چل سکے گا۔ یہ بھی کہا گیا کہ NAB کا ادارہ عزت دار لوگوں کو ذلیل کرتا ہے اور سرکار کے کاموں میں رکاوٹ ڈالتا ہے۔ کوئی بھی سرکاری ملازم ایسے ماحول میں فیصلہ لینے سے ڈرتا ہے۔ پھر کیبنٹ سیکریٹری صاحب نے ایک کمیٹی تشکیل دی، کہ اس مسئلے کا حل تلاش کرے۔ میں نے یہ خبر پڑھی تو خاصا حیران ہوا۔ مجھے ابھی آئے ہوئے شاید دو ماہ ہی گزرے ہوں گے، اس سے پہلے بھی تو NAB کئی برسوں سے چل رہا تھا، آخر میں نے ایسا کیا، کیا کہ اتنی پریشانیاں پیدا کردیں؟ شاید یہ اعلان کہ NAB کا فوکس حکومتی مشینری پر ہوگا اور ان سے پیسے واپس لے کر کیس بند کرنے کا سلسلہ بھی نہیں کیا جائے گا، پریشانی کا باعث رہا ہو۔ یا شاید میری شہرت (reputation)، کہہ سکتا نہیں، بھی باعث تشویش رہی ہو، کہہ نہیں سکتا۔ پھر میں نے کیبنٹ سیکریٹری صاحب کو خط لکھا کہ اگر NAB سے کچھ پریشانیاں تھیں تو مجھ سے کوئی رابطہ کرلیتے اور اس مسئلے کا ہم مل کر کوئی حل نکال لیتے۔ یوں مجھ پر میڈیا کے ہاتھوں دباؤ ڈالنے کی کیا وجہ ہے؟ پھر میں ان سے ملنے گیا۔ نہایت ہی اچھے انسان تھے، جن سے مل کر قدر کرنے کا دل چاہے۔ انہوں نے کہا ضرور اس کا مل کر کوئی حل نکال لیں گے، لیکن اس کے بعد کوئی حل نکالنے کی کوشش نہیں ہوئی۔ (جاری ہے)

☆☆☆☆☆

قسط نمبر 25

کرپشن کے خلاف لڑنے میں کسی نے ساتھ نہ دیا؟

نیب میں چند ماہ بعد ہی اندازہ ہوگیا کہ حکومتی شخصیات میرے خلاف صف آرا ہوگئی ہیں۔میڈیا کو اعتماد میں لینے کی کوشش رائیگاں گئی۔تیل کی انکوائری پر شوکت عزیز سب سے زیادہ ناراض تھے۔لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کی کتاب سے اقتباس

نیب میں آنے کے چند مہینے کے اندر ہی مجھے احساس ہوگیا تھا کہ حکومت کا سارا نظام اور ملک کے بڑے بڑے اشخاص، تمام ہی میرے خلاف صف آرا ہیں۔پھر میں نے سوچا کہ میڈیا کو ساتھ لیتا ہوں، کچھ اپنے لیے حمایت اکٹھی کروں، یوں اکیلے کیسے اور کس کس سے لڑوں گا۔میڈیا کے چند اہم نمائندوں کو 4 مئی 2006ء کو چائے پر بلایا، کچھ نے معذرت کرلی۔تفصیل سے NAB کے بارے میں بریفنگ (briefing) دی، جو رد و بدل کی تھیں وہ بتائیں، اپنی ترجیحات بیان کیں۔میں نے اُن سے کہا ''مجھے احساس ہے کہ آپ پر مجھ سے زیادہ بوجھ ہے۔میرا ایک نکاتی ایجنڈا ہے اور مجھ سے سنبھلتا نہیں، آپ نے اس قوم کا ضمیر ہونے کا بیڑا اُٹھایا ہے اور یقیناً آج کل کے حالات میں، آپ کی زندگی پر اس کا خاصا بوجھ ہوگا۔مجھے خوشی ہے کہ NAB کی selectivity آپ کے ضمیر کو چبھتی ہے''۔پھر میں نے کہا ''میں آج آپ کے ساتھ اپنے خوف اور اپنی امیدیں اس توقع سے بانٹ رہا ہوں کہ خوف سے نکل کر امید تک آنے میں مجھے آپ مدد حاصل رہے۔آپ کو ایک دوسرے کا ساتھ ہے، لیکن میں خود کو یہاں بالکل تنہا محسوس کرتا ہوں''۔

میں نے اُن سے کہا ''کرپشن اس طرح ہمارے معاشرے میں رچ بس گئی ہے کہ اس کو نہ ہی سیاست سے جدا کیا جاسکتا ہے، نہ گورننس سے، نہ عدلیہ سے اور نہ ہی تجارت، اسپتالوں، اسکولوں یا انفرادی باہمی تعلقات سے اور نہ ہی ہماری مسجدوں سے۔شاید اب یہ ہماری زندگیوں میں اس طرح سرائیت کرچکی ہے کہ اس سے چھٹکارا پانا مشکل ہو۔مگر میں نے آپ کو یہاں یہ رونا رونے کے لیے نہیں بلایا۔میں نے آپ کا تعاون حاصل کرنے کے لیے آپ کو زحمت دی ہے کیونکہ میں جانتا ہوں کہ آپ کو اس کرپشن سے ڈسے ہوئے مظلوموں کی چیخیں مجھ سے زیادہ صاف سنائی دیتی ہیں''۔پھر میں نے کہا ''میں یہ کام نہیں کرسکتا۔میں اس ذمہ داری کو نہیں نبھا سکتا جو مجھے سونپی گئی ہے، کرپشن نہیں مٹا سکتا۔یہ میری صلاحیت سے باہر ہے۔پھر بھی چونکہ میں ایک سپاہی ہوں، گو ریٹائر ہو چکا ہوں، جیسے بھی ہوسکا آخری حد تک کرپشن کے خلاف لڑوں گا۔یہ کہتے ہوئے میں اس حقیقت سے بھی آنکھیں بند کرلوں گا کہ کس حقارت سے آج آپ قوم کے ایک سپاہی کو دیکھتے ہیں''۔

پھر اُنہیں NAB کی ساری تفصیلات دینے کے بعد میں نے آخر میں کہا ''میری کوشش رہے گی کہ NAB کو ایسے مقام پر پہنچاؤں کہ یہ ادارہ عزت کے لائق ہو۔شاید مجھ پر ''آئیڈیالسٹ'' کا ٹھپہ لگایا جائے، مگر میں نے یہی دیکھا ہے کہ اصلیت ہمیشہ آئیڈیل سے نیچے ہی رہتی ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اپنے آئیڈیل کا چراغ بجھا دیں''۔میں نے NAB کے مستقبل کے بارے میں کہا ''NAB کو سیاست سے چھٹکارا پاتے ہوئے ایک عرصہ لگے گا اور ہمیں ہوش سے چلنا پڑے گا، ورنہ اینٹی کرپشن کا محل زمین بوس ہوجائے گا۔ہمارے فیڈرل سیکریٹری اس وقت بھی NAB کے قوانین میں رد و بدل کی کوشش میں لگے ہیں''۔اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا ''ایک مجرم کی گردن کی اتنی قیمت نہیں کہ جب الیکشن سر پر ہوں تو حکومت کو غیر مستحکم کردیا جائے اور نہ ہی اتنی قیمت ہے کہ NAB کے مستقبل کو داؤ پر لگا دیا جائے''۔میں نے کہا ''میری پوری کوشش ہوگی کہ NAB کو الیکشن کے کھیل سے باہر رکھوں۔ابھی سے کچھ سیاسی حلقوں سے ایک دوسرے کے خلاف شکایات آنی شروع ہوگئی ہیں۔آج اینٹی کرپشن کسی پارٹی کا ایجنڈا نہیں۔سول سرونٹس بھی چھوٹ چاہتے ہیں اور آدھی درجن مقدس گائیوں کی فائلیں میرے دراز میں پڑی ہیں۔چینی کی انکوائری بند کروائی جاچکی ہے۔تیل کی انکوائری پر دباؤ پر دباؤ بڑھ رہا ہے۔ہر طرف یہی چیخ و پکار ہے کہ معیشت ڈوب جائے گی اور یہ کہ کرپشن اور ترقی ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں کیے جاسکتے۔میری کوشش ہے کہ کوئی توازن قائم رکھ سکوں، مگر میں جانتا نہیں کہ یہ توازن کہاں ٹھہراؤں۔میری رہنمائی کریں۔NAB کی بدخواہی نہ کریں، ملک کو اس ادارے کی ضرورت ہے۔NAB کی مدد کریں''۔یہ ملاقات بھی اُسی کمرے میں ہوئی جہاں ایگزیکٹو بورڈ کی میٹنگ ہوتی تھی اور یہ بھی ویڈیو ریکارڈ ہوگئی۔میں نے بھی ایک کاپی رکھ لی۔میں نے دل سے یہ باتیں کہیں، بہت خلوص سے اُنہیں پکارا، لیکن چونکہ میں سابقہ فوجی تھا، شاید اُن کے دلوں میں میرے خلاف یہی تاثر قائم رہا کہ میں حکومت کا ہی کارندہ ہوں، یوں ہی اُنہیں متاثر کرنے کو بلا لیا ہے۔کچھ حاصل نہ ہوسکا۔

مجھ پر کیچڑ اُچھالا جاتا رہا اور میں اپنی سی کوشش میں لگا رہا۔لڑتا رہا۔ایک سابق گورنر صاحب نے تو یوں بھی کہہ دیا کہ یہ آستین کا سانپ ہے، حالانکہ جانتے تھے کہ میں اُن کی طرح کسی کی آستین میں نہیں پلتا۔پھر 9 دسمبر 2006ء کو جب اینٹی کرپشن ڈے منایا گیا، ہم نے United Against Corruption کی آواز کے ساتھ کانسٹیٹیوشن ایونیو پر مارچ بھی کی۔ایدھی صاحب آئے اور میاں سومرو صاحب اور چند درد رکھنے والے، جن میں گلوکار شہزاد رائے اور رضا ہراج MNA صاحب بھی شامل تھے۔اُس ہی دن کی تقریب میں صدر صاحب کو آنا تھا، نہیں آئے۔وزیر اعظم صاحب آئے اور NAB کو بہت برا بھلا۔کہا یہ ادارہ نااہل ہے، کرپٹ ہے اور حکومت کے باعزت ملازمین کو ذلیل کرتا ہے۔کرسیاں بھرنے کے لیے اسکولوں کے طلبا کو بلا لیا تھا اور کسی کو تو ہم پر اعتقاد تھا نہیں۔صرف سیاسی نعرے کے طور پر NAB کی بات کرتے، جنہیں دوست کہتے ہیں وہ بھی اور جنہیں دشمن کہیں وہ بھی۔شوکت عزیز صاحب جب چلے گئے تو چائے کے وقفے کے دوران، کچھ اخبار والوں نے پوچھا کہ آخر کیا معاملہ ہے، وزیر اعظم آپ سے کیوں اتنے ناراض ہیں؟ میں نے کہا کہ آپ کو اُن سے پوچھنا چاہیے تھا۔تو کسی نے کہا کہ ہم جانتے ہیں، یہ ناراضگی اس لیے کہ آپ تیل کے سلسلے کی انکوائری بند نہیں کر رہے۔جانتے تو سب ہی تھے، لیکن کوئی ہاتھ تھامنے کو تیار نہ تھا۔ہمیشہ کی طرح اکیلے ہی لڑتا رہا۔(جاری ہے)

☆☆☆☆☆

قسط نمبر 26

”مشرف نے چینی قیمتوں میں اضافے کی تحقیقات رکوادی تھیں“

ایگزیکٹو آرڈر میں کہا گیا، انکوائری نہ روکی گئی تو چینی غائب اور قیمتوں میں مزید اضافہ ہوسکتا ہے۔ سیاسی وڈیروں سے ڈرنے والے پھر بھی یہ سمجھتے رہے کہ ہر چیز پر ان کی گرفت ہے۔ لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کی کتاب سے اقتباس

لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کا شمار افواج پاکستان کے مایہ ناز، بلند ہمت، باکردار اور اصول پسند افسران میں ہوتا ہے۔ انہیں جس قدر کامیابیاں حاصل ہوئیں، اس کی وجہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر مکمل یقین ہے۔ جہاں کہیں بھی وطن عزیز کے دفاع اور قومی مفادات کا معاملہ سامنے آیا، وہ حکمرانوں کے سامنے بڑی جرأت اور استقامت سے حاضر سروس جنرل ہوتے ہوئے بھی اختلافی رائے پیش کرتے رہے۔ ڈائریکٹر جنرل تجزیاتی ونگ کی حیثیت سے کارگل کے محاذ کے حوالے سے انہوں نے ہمیشہ حقیقت پسندانہ تجزیہ اعلیٰ فوجی حکام کو مہیا کیا۔ نائن الیون (11/9) کے بعد امریکہ کیلئے فوجی سہولتوں کی فراہمی کے معاملے پر بھی اعلیٰ سطحی فوجی اجلاس میں کھل کر کلمہ حق بلند کیا۔ ان کی ملازمت کا عرصہ فیض کے اس مصرعے کی عملی تفسیر رہا:

جو رکے تو کوہِ گراں تھے ہم، جو چلے تو جاں سے گزر گئے

لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کی اجازت سے، ان کی کتاب ”یہ خاموشی کہاں تک“ سے منتخب اقتباسات قارئین کی معلومات اور دلچسپی کے لیے پیش کیے جارہے ہیں۔

”صدر صاحب نے چینی کی انکوائری بند کروا دی ہے“۔ جنرل حامد جاوید صاحب کا فون تھا، جو صدر صاحب کے ساتھ چیف آف اسٹاف (COS) تھے۔ میں نے کچھ حجت کی کہ ابھی تو شروع ہی کی ہے اور یہ کہ بند کرنے کے بہت برے اثرات ہوں گے، وغیرہ وغیرہ۔ تو کہا ”یہ ان کا ایگزیکٹو آرڈر (executive order) ہے۔ اب یہ انکوائری نہیں ہوگی“۔ میں نے صدر صاحب سے فون پر بات کرنے کی بہت کوشش کی، مگر آنے والے کئی دنوں تک نہ ہی میں ان سے مل سکا اور نہ ہی میرا رابطہ فون پر ہوسکا۔ وہ بہت ”مصروف“ تھے۔ پھر میں نے اخبار میں اعلان کیا کہ ”چینی کی انکوائری بند کردی گئی ہے، کیونکہ یہ کہا جا رہا ہے کہ اس انکوائری کی وجہ سے چینی کی قیمتوں میں مزید اضافہ ہوسکتا ہے، حالانکہ NAB اس موٴقف سے اتفاق نہیں کرتا“۔ اس خبر کے اخبار میں آنے پر جنرل حامد نے فون پر خفگی کا اظہار کیا کہ انکوائری بند کرنے کی خبر اخبار میں کیوں دی گئی؟ میں نے کہا ”اس لیے کہ عوام اس امید پر نہ بیٹھے رہیں کہ NAB ان کے مفاد کا بدستور تحفظ کررہا ہے۔ جب شروع کرنے کی اطلاع دی، تو بند کرنے کا بتانا بھی لازم ہے۔ کیا انہیں دھوکے میں رکھا جائے؟“ پھر یہ سوال اٹھایا کہ یہ کیوں لکھا کہ ”NAB اس موٴقف سے اتفاق نہیں کرتا؟“ میں نے کہا ”اختلاف کرتا ہے، اسی لیے کہا ہے اور یہ بات آپ اچھی طرح جانتے ہیں اور یہ بھی جانتے ہیں کہ انکوائری کیوں بند ہوئی“۔ کچھ بدمزگی کے بعد بات ختم ہوگئی۔

نیب میں میرے آنے کے کچھ عرصے بعد بازار میں چینی کی قیمت میں یکا یک اضافہ کردیا گیا تھا۔ اخباروں میں بھی اس کے بارے میں کافی تفصیلات چھپیں۔ میں نے NAB کے ذریعے کچھ بنیادی باتیں معلوم کیں، تو قیمت بڑھنے کی کوئی معقول وجوہات سامنے نہ آئیں۔ ایک چھوٹی سی ابتدائی تفتیش (preliminary inquiry) کی، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ صرف چینی کی ملوں کے مالکان کی مرضی سے قیمت بڑھائی گئی ہے۔ اس کی وجوہات ہماری مارکیٹ کے حالات پر مبنی نہیں تھیں۔ میں نے اس کی باقاعدہ انکوائری کے احکامات جاری کردیئے۔ یہ دیکھتے ہوئے کہ چینی کے کاروبار کی پیچیدگیاں شاید ہماری سمجھ میں نہ آسکیں، میں نے ریٹائرڈ بریگیڈیئر اکرم علی خان صاحب سے درخواست کی کہ اس سلسلے میں اپنے تجربے سے ہمیں مستفید فرمائیں۔ یہ فوجی فاؤنڈیشن میں کئی سال چینی کے کاروبار سے منسلک رہ چکے تھے۔ ان کا تعلق میری ہی یونٹ سے تھا اور مجھے ان پر پورا اعتماد تھا۔

انکوائری شروع ہوتے ہی کچھ سیاسی حلقوں میں کھلبلی مچ گئی۔ پہلے ان کا ایک وفد وزیر اعظم صاحب کے پاس آیا، پھر صدر صاحب کو بھی ملنے گیا۔ ان سب کے نام اور تفصیلات اخباروں میں آتی رہیں۔ لیفٹیننٹ جنرل حامد جاوید نے مجھ سے کہا کہ میں یہ انکوائری بند کردوں، ورنہ مارکیٹ سے چینی اٹھالی جائے گی۔ پھر مجھے چیئرمین CBR عبداللہ یوسف صاحب ملے، اور سمجھایا کہ تم مارکیٹ کے اتار چڑھاؤ (marked dynamics) کو نہیں سمجھتے ہو، ذرا آرام سے چلو۔ یہ ہماری پہلی ملاقات تھی۔ میں نے لوگوں کی مشکلات کا ذکر کیا، تو کہنے لگے ”اگر تم نے انکوائری بند نہ کی تو چینی کی قیمت دگنی ہوجائے گی۔ تم کیا کرلو گے؟ پھر لوگوں کا کیا ہوگا؟“۔ میں وزیر اعظم صاحب سے بھی ملا۔ میں نے کہا صرف چار چھ بڑے حضرات ہیں، جن کے زور پر چینی کی قیمت یوں بڑھائی گئی ہے۔ یہ تو حکومت کے منہ پر طمانچہ ہے۔ اگر حکومت اور NAB مل کر بھی انہیں قابو میں نہ رکھ سکیں تو پھر گورنینس کیا رہ جائے گی؟“۔ کہنے لگے ”یہ گورنینس کا مسئلہ نہیں ہے، اس میں صرف سیاسی پیچیدگیاں ہیں“۔ انہوں نے کہا ”مجھے کوئی اعتراض نہیں، اگر آپ یہ انکوائری جاری رکھیں“۔

میں نے سوچا کہ کچھ عرصے کا ہی وقت چاہئے کہ چینی کی قیمت سنبھلی رہے، پھر انکوائری کے بعد حالات قابو میں آجائیں گے۔ دفتر آکر چینی برآمد کرنے والے بڑے تاجروں کو کہلوایا کہ وہ اسلام آباد آکر مجھے ملیں۔ انہوں نے خوشی کا اظہار کیا اور کہا کہ کسی قسم کی فکر کی ضرورت نہیں، ہم نہ ہی مارکیٹ سے چینی غائب ہونے دیں گے اور نہ ہی اس کی قیمت میں اضافہ ہوگا۔ لیکن اس سے پہلے کہ میری ان تاجران سے ملاقات ہوتی، چینی کی انکوائری بند کروا دی گئی۔

اس انکوائری کے بند ہونے سے NAB کی ساکھ پر بہت برا اثر پڑا۔ اخبار میں ہمارے اعلان کے باوجود کوئی اخبار والا پوچھنے نہ آیا کہ ماجرا کیا ہے۔ صرف کچھ دن کیچڑ اچھالا جاتا رہا۔ شاید انہوں نے سوچا ہو کہ سارا ہی ڈرامہ چل رہا ہے، چیئرمین NAB بھی فوجی ہے، اسی ڈرامے کا کردار ہوگا۔ وہ دن ہی ایسے تھے۔ تمام میڈیا مشرف صاحب کے خلاف ہوچکا تھا۔ چینی کی ملوں کے مالکان، سیاسی وڈیرے، عوام کے اصل غمگسار، جھوٹ سے بھرے دل لیے، کلف لگائے لباس پر چمکتے چہرے سجائے، سیاہ بوٹ پہننے والے کی گردن پر پاؤں رکھے کھڑے تھے۔ اس ہی کے ساتھیوں کے کندھوں پر ہاتھ رکھے۔ اور وہ، سر جھکائے یہی سمجھتے رہے کہ ہر چیز میری گرفت میں ہے۔ سمجھا کہ جب میرے اردگرد طواف کرنے والے خوش ہیں، تو سب ٹھیک ہی ہوگا۔ اس خودفریبی میں سکون تھا۔ اس میں تصادم نہیں تھا، جس سے وہ گھبراتے تھے۔ جس سے اس کا حوصلہ ٹوٹتا تھا۔ اس محدود اور محفوظ گوشے میں بہادری کو کوئی للکارتا نہیں تھا۔ خوف چھپا رہتا۔ اس میں تحفظ کا سراب تھا۔ اس ہی راہ پر چلتے چلتے وہ تنگ گلی میں پھنستے چلے گئے۔

(جاری ہے)

☆☆☆☆☆

وزارت پٹرولیم میں 81 ارب روپے کے گھپلے تھے

نیب کی ابتدائی رپورٹ مشرف کو دی تو انہوں نے اسے پھینک دیا - میں بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بلند آواز میں کہا، پھر کوئی اور چیئرمین نیب ڈھونڈ لیں - میں آپ کے ساتھ کام نہیں کر سکتا - لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کی کتاب سے اقتباس

صدر صاحب نے میز پر رکھے کاغذات کو ہاتھ کے جھٹکے سے دھکیلا، وہ پھسلتے ہوئے میز کے آخری سرے پر جا کر ٹھہر گئے۔ "I don't care what you have written in it. I don't even want to read it" (مجھے پروا نہیں کہ تم نے اس میں کیا لکھا ہے۔ میں اسے پڑھنا بھی نہیں چاہتا)۔ انہوں نے غصے سے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ یہ اکتوبر 2006ء کی بات ہے۔ وہ اپنے دفتر میں بیٹھے تھے۔ میز کے سامنے میں اور جنرل حامد جاوید۔ تیل کی انکوائری کی رپورٹ تھی، جسے انہوں نے یوں پھینکا تھا۔ ذہن سے خیال گزرا کہ اس ملک کے محکمۂ احتساب کا سربراہ ہوں، اور آپ میری بات بھی سننا گوارا نہیں کرتے! میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میری آواز بھی بلند ہو گئی "پھر کوئی اور چیئرمین NAB ڈھونڈ لیں، میں آپ کے ساتھ کام نہیں کر سکتا"۔ جنرل مشرف بھی کھڑے ہو گئے، جنرل حامد بھی۔ کچھ دیر سناٹا رہا۔ وہ مجھے سٹپٹائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ میں کمرے سے باہر جانے لگا، تو جنرل حامد کی آواز آئی۔ "سر! ہم اس انکوائری کو دیکھتے ہیں۔ کوئی حل نکال لیں گے"۔ وہ بھی میرے پیچھے باہر آ گئے۔
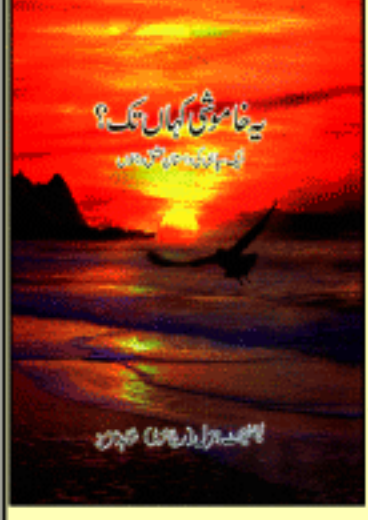
لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کا شمار افواج پاکستان کے مایہ ناز، بلند ہمت، با کردار اور اصول پسند افسران میں ہوتا ہے۔ انہیں جس قدر کامیابیاں حاصل ہوئیں، اس کی وجہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر مکمل یقین ہے۔ جہاں کہیں بھی وطن عزیز کے دفاع اور قومی مفادات کا معاملہ سامنے آیا، وہ حکمرانوں کے سامنے بڑی جرأت اور استقامت سے حاضر سروس جنرل ہوتے ہوئے بھی اختلافی رائے پیش کرتے رہے۔ ڈائریکٹر جنرل تجزیاتی ونگ کی حیثیت سے کارگل کے محاذ کے حوالے سے انہوں نے ہمیشہ حقیقت پسندانہ تجزیہ اعلیٰ فوجی حکام کو مہیا کیا۔ نائن الیون (11/9) کے بعد امریکہ کیلئے فوجی سہولتوں کی فراہمی کے معاملے پر بھی اعلیٰ سطحی فوجی اجلاس میں کھل کر کلمہ حق بلند کیا۔ ان کی ملازمت کا عرصہ فیض کے اس مصرعے کی عملی تفسیر رہا:

جو رکے تو کوہِ گراں تھے ہم، جو چلے تو جاں سے گزر گئے

لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کی اجازت سے، ان کی کتاب "یہ خاموشی کہاں تک" سے منتخب اقتباسات قارئین کی معلومات اور دلچسپی کے لیے پیش کیے جا رہے ہیں۔

میں جنرل مشرف کو اس انکوائری کے بارے میں شروع میں ہی بتا چکا تھا۔ NAB میں آنے کے بعد ان سے میری پہلی ملاقات یکم اپریل 2006ء کو ہوئی، جب انہیں 2005ء کی سالانہ رسمی رپورٹ دینے گیا۔ میں نے انہیں کرپشن کی روک تھام کے بارے میں اپنے تاثرات اور کام کی کچھ تفصیلات بتائیں۔ جو ترامیم NAB کی تنظیم اور کارروائیوں میں کی تھیں، وہ بتائیں۔ یہ بھی بتایا کہ نواز شریف صاحب کے خلاف کیسز پر اب تک کوئی انکوائری نہیں ہوئی ہے، کئی ڈبوں میں کاغذات بند پڑے ہیں۔ وہ چونکہ ملک میں حاضر نہیں ہیں، انکوائری مکمل تو نہیں کی جا سکتی، مگر اتنا کام تو ہو سکتا ہے کہ الزامات کا کوئی جواز بنے۔

میں نے کہا کہ اگر وہ کسی وقت ملک میں واپس آتے ہیں، تو بغیر کسی جواز کے NAB ان کو گرفتار نہیں کر سکے گا۔ میں نے یہ اس لیے کہا کہ کہیں اگر ایسا موقع آئے، تو وہ مجھ سے کوئی توقع نہ رکھیں۔ مگر انہوں نے کہا کہ ان کاغذات کو بند ہی پڑے رہنے دیں۔ کیونکہ اس سلسلے سے سیاسی توازن منسلک تھا، میں نے یونہی کیا۔ بے نظیر بھٹو اور زرداری صاحب کے خلاف کیسز کا احوال بتایا۔ پھر میں نے انہیں یہ بتایا کہ میں چینی اور تیل کے سلسلے میں انکوائری کر رہا ہوں، تھوڑی بہت تفصیلات بھی بتائیں۔ وہ یہ سن کر کچھ غیر مطمئن سے ہوئے اور کہا کہ ان میں کچھ نہیں نکلے گا، خوامخواہ اپنا وقت ضائع کرو گے۔ میں نے ان سے کہا کہ میں انکوائری کر کے آپ کو بھجوا دوں گا، آپ خود فیصلہ کر لیجئے گا کہ کیا کرنا ہے۔ اس پر انہوں نے بات کو جانے دیا۔ جو دباؤ ان پر پڑنے والا تھا، وہ اس سے ابھی واقف نہیں تھے، اور نہ ہی میں۔

اخبارات میں خاصی تفصیلات چھپ چکی تھیں کہ وزارت پیٹرولیم میں بڑے پیمانے پر گھپلے ہو رہے ہیں۔ شاید وزارت کے کچھ دل جلے افسران نے اخبار والوں کو اس خورد برد کی تفصیلات فراہم کی تھیں۔ جب میں نے ابتدائی تفتیش کروائی، تو ان تمام الزامات میں حقیقت دکھائی دی۔ پھر 30 مارچ 2006ء کو، 2001ء سے تیل کی قیمتوں کے تعین کے طریقۂ کار اور اس پر عمل درآمد کی باقاعدہ انکوائری کے احکامات جاری کئے۔ کیبنٹ کے ایک فیصلے کے تحت یکم جولائی 2001ء سے تیل کی قیمتوں کا تعین OGRA (Oil and Gas Regulatory Authority) کو سونپ دیا گیا تھا، لیکن حقیقتاً یہ کام نجی آئل کمپنیوں کی ایڈوائزری کمیٹی (OCAC) ہی کرتی رہی۔ اس انکوائری کا تعلق کسی ملکی یا غیر ملکی تیل کی کمپنی یا پاکستان میں موجود کسی ریفائنری کی کارکردگی سے نہیں تھا۔ صرف یہ دیکھنا تھا کہ عوام جو پیٹرول پمپوں پر تیل کی قیمت ادا کرتی ہے، اس کا تعین حکومت کس طرح سے کر رہی ہے۔ اس کے لیے بھی ایک ایکسپرٹ، عباس رضا صاحب کی امداد حاصل کی، تاکہ اس پیچیدہ مسئلے کو سمجھنے میں دشواری نہ ہو۔ آہستہ آہستہ میں نے بھی اس پر کچھ دسترس پا لی۔ پھر وزارت پیٹرولیم اور وزارت خزانہ کے افسران کو بلوایا، تمام متعلقہ کاغذات حاصل کئے اور ان کے نکتۂ نظر کو سنا گیا۔

وزیراعظم صاحب کے مشیر برائے توانائی (Advisor to PM on Energy) مختار احمد انکوائری شروع ہونے کے دو ہفتے بعد ہی NAB میں آ گئے اور تفصیلات جاننی چاہیں۔ انہیں تمام تفصیلات، جو اس وقت تک NAB کے علم میں تھیں، بتائی گئیں۔ وہ انکوائری کے حق میں نہیں تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ کوئی بدعنوانی نہیں ہوئی اور اس انکوائری سے صرف حکومت کے کام میں مداخلت ہو گی۔ پھر سیکریٹری پیٹرولیم، احمد وقار مجھ سے ملنے آئے اور انہیں بھی تمام تفصیلات بتائیں۔ انکوائری کے دوران لگاتار مجھ پر اسے ختم کرنے کے لیے دباؤ پڑتا رہا۔ زیادہ متحرک جنرل حامد اور چیئرمین CBR عبداللہ یوسف تھے۔ جب عبداللہ یوسف کے بیان کا وقت آیا، تو میں نے کہا کہ یہ بہت سینئر افسر ہیں، ان سے پوچھ لیں کہ کیا ہم انہیں ایک سوال نامہ بھیج دیں، جس کے جواب وہ لکھ کر ہمیں بھیجیں، یا کسی افسر کو ان کے پاس بیان لینے کے لیے بھیج دیں، مگر انہوں نے کہا کہ میں خود NAB میں آؤں گا۔ ان کے آنے پر، NAB کے ڈپٹی چیئرمین میجر جنرل محمد صدیق نے ان کا کار پورچ میں استقبال کیا، پھر اپنے دفتر لے گئے، وہیں ان سے چند سوالات پوچھے گئے، چائے پلائی، پھر جنرل صاحب انہیں کار تک چھوڑنے آئے۔ مگر اس بات کا اس قدر جھوٹا پروپیگنڈا کیا گیا کہ اتنے باعزت انسان کو NAB نے بلا کر ذلیل کیا۔ وزیراعظم صاحب نے اس کی جھوٹی کہانیاں بنائیں اور جنرل مشرف بھی سن کر خفا ہوئے اور فون پر مجھ سے اس کا اظہار بھی کیا۔

مجھے ایک دن دفتر بلا لیا۔ خاصے ناراض تھے۔ کہنے لگے۔ "یہ تم کیا تیل کی انکوائری میں لگے ہوئے ہو؟ اس میں کچھ گھپلا نہیں ہے۔ پہلے تم نے چینی کی انکوائری شروع کر دی، اس میں بھی کچھ نہیں تھا۔ میں نے خود تمام تفصیلات معلوم کی ہیں، خود دیکھا ہے، DHA کی بھی انکوائری کر دی تھی، اس میں بھی کچھ نہیں تھا"۔ میں چپ رہا تو کہا "تم بہت ہٹ دھرم (rigid) ہو، تم سمجھتے ہو کہ تم ہی ٹھیک ہو، باقی ساری دنیا غلط ہے"۔ اتنا سن کر مجھ سے رہا نہ گیا۔ چینی کی انکوائری شروع ہوتے ہی بند کروا دی تھی۔ خود کیا دیکھا تھا؟ وہی نا جو ملوں کے مالکان نے بتایا؟ میں نے کہا "سر! ذرا ٹھہر جائیں۔ اس مباحثے کو یاد کریں، جس میں آپ نے کہا تھا کہ 90 فیصد تمہاری بات مان لیتے ہیں کہ تم ٹھیک ہو، لیکن 10 فیصد یہ بھی تو گنجائش دو کہ ہم ٹھیک ہو سکتے ہیں۔ خود اپنے منہ سے آپ نے یہ بات کہی تھی۔ مگر حیرت کی بات ہے کہ منصوبہ پھر بھی اس 10 فیصد تخمینے پر ہی بنایا گیا، 90 فیصد پر نہیں۔ اس دن بھی آپ نے مجھ پر یہی الزام لگایا تھا، تو کون ریجڈ (rigid) تھا؟ اور آج بھی مجھ پر یہی الزام ہے"۔ کھسیانا سا منہ بنا لیا اور کہا "کون سا مباحثہ؟ مجھے تو یاد نہیں"۔ سارے کور کمانڈرز کی موجودگی میں گھنٹوں کی بحث اور اس کا وہ انجام، کون بھول سکتا ہے؟ پھر میں نے دوسری بات یاد دلائی "اور جہاں تک DHA کا سوال ہے، آپ نے خود کہا تھا کہ بڑے پیمانے پر کرپشن ہوئی ہے، انہیں سزا ملنی چاہئے، لیکن کچھ اور وجوہات کی بنا پر اپنا فیصلہ مؤخر کر دیا تھا۔ آپ کو یاد ہے نا؟" موڈ بدل گیا، آواز دھیمی ہو گئی، کہنے لگے "دیکھو نا، تم نے بات ہی اتنی بڑھا دی تھی۔ خاموشی سے مجھے بتا دیتے، ہم ان لوگوں کو وہاں سے ہٹا دیتے۔ DHA کا مسئلہ ختم ہو جاتا"۔ یعنی معاملے کو جھاڑ کر قالین کے نیچے کر دیتے۔ خیر، پرانی باتیں تھیں، اب انہیں مزید چھیڑ کر کیا کرتا۔ یہ کہہ کر واپس آ گیا کہ میں انکوائری مکمل کر کے آپ کو بھجوا دوں گا۔ جو آپ مناسب سمجھیں کر لیجئے گا۔

جنرل حامد صاحب کے دفتر سے لگاتار دباؤ پڑتا رہا کہ جتنی بھی انکوائری کی ہے، ختم کر کے بھجوائیں۔ جون کے شروع میں، ان کو انکوائری کی ابتدائی رپورٹ کی تفصیلات ان کے دفتر جا کر بتائیں۔ سن کر پریشان ہو گئے، کہنے لگے یہ ٹھیک نہیں لگتا۔ رپورٹ اپنے پاس رکھنے لگے، میں نے کہا کہ ابھی اس پر کچھ کام رہتا ہے، میں جلد ہی آپ کو بھجوا دوں گا۔ 13 جون کو میں نے انکوائری کی ابتدائی رپورٹ، سرکاری طور پر، وزیراعظم صاحب کے دفتر بھجوا دی اور صدر صاحب کے لیے اس کی کاپی جنرل حامد کو۔ میں نے منسلک خط میں، جس پر میرے دستخط تھے۔ لکھا کہ ابتدائی انکوائری میں 81 ارب روپے سے زائد کی مالیاتی خورد برد کا انکشاف ہوا ہے۔ لکھا کہ کوئی مناسب تاریخ طے کر لی جائے، تاکہ متعلقہ شخصیات بیٹھ کر NAB کی اس رپورٹ پر غور کر سکیں اور کسی حتمی نتیجے پر پہنچ سکیں۔ اور یہ کہ موزوں ہو گا کہ اس میٹنگ سے پہلے، انکوائری کے انکشافات پر وزارت پیٹرولیم کے جوابات بھی لے لیے جائیں، تاکہ معنی خیز مشاورت ہو سکے۔ (جاری ہے)

☆☆☆☆☆

قسط نمبر 28

”وزارت پٹرولیم میں گھپلوں کو دبانے کیلئے دباؤ بڑھ گیا“

نیب کی تحقیقات میں وزارت کے افسران الزامات کا جواب نہ دے سکے تو رپورٹ وزیراعظم کو بھجوادی-انہوں نے اپنے مشیروں

ڈاکٹر سلمان اور مختار احمد کے ذریعے کرپشن سے پاک رپورٹ بنوالی-لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کی کتاب سے اقتباس
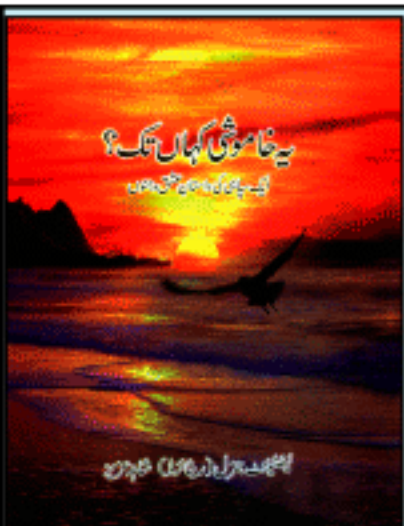
لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کا شمار افواج پاکستان کے مایہ ناز، بلند ہمت، باکردار اور اصول پسند افسران میں ہوتا ہے۔ انہیں جس قدر کامیابیاں حاصل ہوئیں، اس کی وجہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر مکمل یقین ہے۔ جہاں کہیں بھی وطن عزیز کے دفاع اور قومی مفادات کا معاملہ سامنے آیا، وہ حکمرانوں کے سامنے بڑی جرأت اور استقامت سے حاضر سروس جنرل ہوتے ہوئے بھی اختلافی رائے پیش کرتے رہے۔ ڈائریکٹر جنرل تجزیاتی ونگ کی حیثیت سے کارگل کے محاذ کے حوالے سے انہوں نے ہمیشہ حقیقت پسندانہ تجزیہ اعلیٰ فوجی حکام کو مہیا کیا۔ نائن الیون (11/9) کے بعد امریکہ کیلئے فوجی سہولتوں کی فراہمی کے معاملے پر بھی اعلیٰ سطحی فوجی اجلاس میں کھل کر کلمہ حق بلند کیا۔ ان کی ملازمت کا عرصہ فیض کے اس مصرعے کی عملی تفسیر رہا:

جو رکے تو کوہِ گراں تھے ہم، جو چلے تو جاں سے گزر گئے

لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کی اجازت سے، ان کی کتاب ”یہ خاموشی کہاں تک“ سے منتخب اقتباسات قارئین کی معلومات اور دلچسپی کے لیے پیش کیے جا رہے ہیں۔

تیل انکوائری کی ابتدائی رپورٹ ملتے ہی جنرل حامد جاوید نے مجھے اپنے دفتر بلالیا۔ بہت ناراض تھے۔ کہنے لگے ”آپ نے تو اس کو آفیشل (official) بنا دیا، خط لکھ دیا۔ مجھے ویسے ہی انکوائری دے دیتے“۔ میں نے کہا ”میں کوئی ذاتی کام تو نہیں کر رہا، آفیشل کام ہے، آفیشل طریقے سے ہی کروں گا“۔ پریشانی میں کاغذوں کو الٹ پلٹ کر دیکھتے رہے۔ کہنے لگے ”اب اس کی سب کو خبر ہو جائے گی، یہ آپ نے کیا کیا؟“۔ میں نے ان سے کہا نہیں کہ آپ سب کے سب جو مل کر اسے دبانے کی کوششیں کر رہے ہیں، اسی لیے میں نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے۔ پھر میں نے ان سے کہا ”آپ اس میں کیوں پڑتے ہیں اور صدر صاحب کو بیچ میں کیوں لاتے ہیں۔ حکومت کا کام ہے، وزیراعظم کو کرنے دیں۔ میں نے اسی لیے خط وزیراعظم صاحب کو لکھا ہے۔ آپ کو صرف اطلاع کیلئے کاپی بھجوائی ہے“۔ پھر ان کا تجسس دیکھتے ہوئے کہا کہ ایک میٹنگ رکھوائی ہے جس میں NAB کی انکوائری ٹیم اپنی ابتدائی انکوائری کے انکشافات پیش کرے گی، اس میں حکومت کے تمام متعلقہ افسران بھی شامل ہوں گے، تاکہ میں ان کا نکتۂ نظر بذات خود سن لوں۔ تجویز دی کہ اگر آپ مناسب سمجھیں تو کوئی سے بھی ماہرین بھیج دیں، تاکہ ان کی رائے بھی سن لوں اور منصفانہ طور پر کسی نتیجے پر پہنچ سکوں۔

سپریم کورٹ میں بھی اس سلسلے میں مولوی اقبال حیدر، انجینئر اقبال ظفر جھگڑا اور سینیٹر رخسانہ زبیری نے حکومت کیخلاف رٹ دائر کی تھی (Constitution Petition 32, 33, 34/2005)۔ کورٹ نے NAB کو 22 جون کی تاریخ دی کہ اگر آپ کی رپورٹ تیار ہے، تو کورٹ میں پیش کریں۔ مجھے صدر کے دفتر سے منع کیا گیا کہ یہ رپورٹ ابھی نہیں دینی۔ رپورٹ ویسے بھی ابھی حکومت کے زیرغور تھی۔ میں نے کورٹ کو یہی جواب دیا کہ ہماری رپورٹ پر ابھی حکومت غور کر رہی ہے اور ہمیں ان کے فیصلے کا انتظار ہے۔ جب انکوائری پر آخری میٹنگ کی تاریخ طے ہو گئی، تو میں نے جنرل حامد صاحب کو دوبارہ فون پر کہا کہ کسی غیرجانبدار تیل کے کاروبار کو سمجھنے والے شخص کو بھیج دیں، تاکہ ہماری میٹنگ میں بیٹھ سکے، مگر انہوں نے کہا کہ آپ لوگ خود دیکھ لیں، ہم بعد میں دیکھیں گے۔ میں ”بعد میں دیکھیں گے“ کا مفہوم سمجھ رہا تھا۔ وزیراعظم صاحب نے بھی کسی ایکسپرٹ کو بھیجنے سے معذرت کرلی۔ 4 جولائی کو یہ میٹنگ رکھی گئی۔ اس میں پیٹرولیم اور وزارت خزانہ کے تمام متعلقہ افسران آئے۔ NAB کی انکوائری بہت تفصیل سے کی گئی تھی۔ کسی الزام کا وزارت پیٹرولیم کے افسران کے پاس کوئی مناسب جواب نہیں تھا۔ پھر انکوائری کو حتمی شکل دے کر وزیراعظم صاحب کو بھجوادی، ان سے ملنے بھی گیا۔ کہنے لگے، آپ لوگوں کو اس معاملے کی اتنی سمجھ نہیں ہے، کچھ ماہرین سے اس انکوائری کا تجزیہ کروا لیتے ہیں۔ میں نے کہا ضرور۔ کہنے لگے ”میں اپنے مشیر برائے مالیاتی امور (Advisor to PM on Finance and Economic Affairs) ڈاکٹر سلمان شاہ صاحب اور مشیر برائے توانائی مختار احمد صاحب سے کہوں گا کہ وہ اس انکوائری کو دیکھ لیں۔ وہ آپ سے بھی آ کر ملیں گے، تاکہ آپ کا نکتۂ نظر جانچ سکیں“۔

واپس دفتر پہنچا، تو کچھ دیر بعد وزیراعظم صاحب کا فون آیا۔ شاید وہ اب تک اپنے مشیروں سے مل چکے تھے۔ کہنے لگے ”ایک بات کہنی رہ گئی تھی، وہ یہ کہ ان ماہرین کا جو بھی فیصلہ ہوگا، وہ حتمی سمجھا جائے گا، کیونکہ یہ لوگ ان پیچیدہ چیزوں کو آپ سے اور مجھ سے بہتر سمجھتے ہیں۔ یہ بہت الجھا ہوا سلسلہ ہے، عام آدمی کی سمجھ سے باہر ہے۔ اگر ماہرین سمجھتے ہیں کہ انکوائری میں کچھ نہیں ہے، تو کیس ختم کر دیا جائے گا“۔ میں نے کہا ”اگر ان کی بات میری سمجھ میں آ گئی اور مجھے تسلی ہو گئی، تو یقیناً کیس ختم ہو جائے گا“۔ کہنے لگے ”جہاں تک حکومت پاکستان کا تعلق ہے یہ کیس ختم ہو جائے گا“۔ میں نے کہا ”حکومت پاکستان تو جب چاہے یہ کیس ختم کر سکتی ہے، لیکن جہاں تک NAB کا تعلق ہے، یہ کیس تب بند ہوگا جب چیئرمین NAB یہ سمجھے گا کہ کیس بند ہونا چاہئے“۔ کہنے لگے ”جب وقت آئے گا تو دیکھا جائے گا“۔ میں نے کہا ”سر! آپ وزیراعظم ہیں، میں چاہتا ہوں کہ آپ کو وقت سے پہلے پتا ہو کہ آگے کیا ہونے والا ہے“۔ کہنے لگے ”دیکھیں گے“۔ بات ختم ہو گئی۔

ماہرین کی یہ ٹیم مجھے ملنے نہ آئی۔ 23 اگست کو وزیراعظم کے دفتر سے خط آیا۔ لکھا تھا، NAB کی رپورٹ کا دونوں مشیروں نے جائزہ لیا ہے۔ ان کا تجزیہ خط کے ساتھ منسلک ہے۔ 24 اگست کو وزیراعظم کے دفتر میں آپ کی رپورٹ اور اس تجزیے پر میٹنگ ہے۔ تجزیے کا نچوڑ یہ تھا کہ کوئی کرپشن نہیں ہوئی۔ کچھ غلطیاں ہوئی ہیں جو درست کرلی جائیں گی۔ لکھا تھا کہ NAB میں اس کام کو سمجھنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔ میں دیئے ہوئے وقت پر وزیراعظم کے دفتر پہنچ گیا، مشیر نہیں آئے۔ وزیراعظم نے کہا اب اس معاملے کو جانے دیں، اس میں کچھ نہیں ہے۔ بہرحال آپ اپنی تسلی کیلئے مشیروں سے مل لیجئے گا۔ میں نے کہا کہ مشیروں نے تو مجھ سے ملے بغیر ہی رپورٹ بنالی، تو کہا کہ اب مل لیں۔ 28 ستمبر کو مشیروں سے ملاقات ہو سکی۔ میں اور عباس رضا صاحب ان کے دفتر گئے۔ ان کے پاس NAB کی ہر بات کا سطحی سا جواب تھا، بالکل وہی جواب جو وزارت پیٹرولیم دیتی تھی اور کسی منطق کو سننے پر آمادہ نہیں تھے۔ کہتے تھے دنیا میں تیل کی قیمتوں میں اضافے کی وجہ سے یہ سب ہوا ہے، حالانکہ انکوائری میں تیل کی قیمت خرید وہی دکھائی گئی تھی جو اس وقت تھی۔ مگر وہ صرف جھوٹے اور بے بنیاد جواز بیان کرتے رہے۔ میں میٹنگ کے بیچ سے اٹھ کر چلا آیا۔ وزیراعظم چونکہ ہر صورت اس انکوائری کو ختم کرانا چاہتے تھے، میرے پاس اب اور کوئی چارہ نہ تھا، سوائے اس کے کہ معاملے کو صدر صاحب کی طرف موڑ دوں۔ (جاری ہے)

☆☆☆☆☆

قسط نمبر 29

’’پی پی سے مل جانے کا الزام جنرل حامد نے لگایا تھا‘‘

انہوں نے جنرل مشرف کو تیل انکوائری رپورٹ پر نوٹ لکھ بھیجا ’’یہ وہی الزامات ہیں جو پی پی کی رخسانہ زبیری نے عدالت میں لگائے ہیں‘‘۔ مشرف غیر جانبدار ماہر مقرر کرنے پر تیار ہوگئے۔ لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کی کتاب سے اقتباس

لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کا شمار افواج پاکستان کے مایہ ناز، بلند ہمت، باکردار اور اصول پسند افسران میں ہوتا ہے۔ انہیں جس قدر کامیابیاں حاصل ہوئیں، اس کی وجہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر مکمل یقین ہے۔ جہاں کہیں بھی وطن عزیز کے دفاع اور قومی مفادات کا معاملہ سامنے آیا، وہ حکمرانوں کے سامنے بڑی جرأت اور استقامت سے حاضر سروس جنرل ہوتے ہوئے بھی اختلافی رائے پیش کرتے رہے۔ ڈائریکٹر جنرل تجزیاتی ونگ کی حیثیت سے کارگل کے محاذ کے حوالے سے انہوں نے ہمیشہ حقیقت پسندانہ تجزیہ اعلیٰ فوجی حکام کو مہیا کیا۔ نائن الیون (11/9) کے بعد امریکہ کیلئے فوجی سہولتوں کی فراہمی کے معاملے پر بھی اعلیٰ سطحی فوجی اجلاس میں کھل کر کلمہ حق بلند کیا۔ ان کی ملازمت کا عرصہ فیض کے اس مصرعے کی عملی تفسیر رہا:

جو رکے تو کوہِ گراں تھے ہم، جو چلے تو جاں سے گزر گئے

لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کی اجازت سے، ان کی کتاب ’’یہ خاموشی کہاں تک‘‘ سے منتخب اقتباسات قارئین کی معلومات اور دلچسپی کے لیے پیش کیے جارہے ہیں۔☆

اگلے دن جنرل پرویز مشرف کو خط کے ذریعے تمام معاملات سے آگاہ کیا۔ خط میں لکھا کہ وزیراعظم صاحب نے اس سلسلے میں اپنے مشیروں کی ایک کمیٹی بنائی تھی، جس نے NAB سے مشاورت کے بغیر اپنی یک طرفہ رپورٹ بنالی، اور وہی نکتۂ نظر پیش کیا ہے جو وزارت پیٹرولیم دے رہی ہے۔ NAB کی انکوائری میں لگائے کسی الزام کا براہ راست جواب نہیں دیا، اور نہ ہی کسی الزام کو رد کیا ہے۔ بنیادی طور پر کمیٹی کا یہ کہنا ہے کہ NAB حکومت کی پالیسی پر اعتراض کررہا ہے، جو اس کا اختیار نہیں۔ میں نے لکھا کہ یہ سراسر غلط تاثر ہے اور اس لیے دیا جارہا ہے کہ انکوائری کو مشتبہ بنایا جائے۔ کمیٹی کی رپورٹ میں چوری کے تمام الزامات کو تیل کی خرید و فروخت اور قیمتیں متعین کرنے کے نظام کی پیچیدگیوں اور حکومت کے کام میں چھوٹی چھوٹی غلطیوں کی آڑ میں چھپایا گیا ہے۔ کچھ چیزوں کے بارے میں لکھا ہے کہ اب وزارت نے وہ غلطیاں درست کرلی ہیں، مثلاً General Sales TaxGST() کا نفاذ۔ مگر اس مد میں جو 18 ارب روپے سے اوپر کا خسارہ حکومت کو ہوا۔ وہ کہاں سے پورا ہوگا؟ لکھا کہ کمیٹی کا کہنا ہے کہ اس نظام میں یقیناً کمزوریاں رہی ہیں لیکن یہ چیزیں وزارت خود ہی ٹھیک کرلے گی، اس میں NAB کو دخل اندازی کی ضرورت نہیں۔ میں نے یہ بھی لکھا کہ جنہیں غلطیاں کہا جارہا ہے ان سے اربوں روپے کا خسارہ ہوا ہے، یہ غلطیاں نہیں بلکہ بڑے پیمانے پر خورد برد ہے۔ لکھا کہ رپورٹ کہتی ہے کہ NAB اس لائق نہیں کہ اس پیچیدہ مسئلے کو سمجھ سکے، تو اگر NAB کی کارکردگی پر اعتقاد نہیں، تو انکوائری کو مزید آگے بڑھا کر اختتام تک پہنچانے کیلئے کوئی سے بھی تجربہ کار ماہرین مارکیٹ سے لیے جاسکتے ہیں، تاکہ اس خورد برد سے مستفید ہونے والے حضرات کو انجام تک پہنچایا جاسکے۔

جب یہ خط جنرل حامد کو ملا تو کچھ دنوں بعد انہوں نے مجھے دفتر بلالیا۔ ان ہی دنوں مجھے خبر ملی تھی کہ صدر صاحب کو یہ بتایا گیا ہے کہ میں، پیپلز پارٹی والوں کے ساتھ مل کر، جن کی سینیٹر رخسانہ زبیری نے سپریم کورٹ میں حکومت کیخلاف رٹ کی ہوئی تھی، حکومت کو بدنام کرنا چاہتا ہوں، اور یہ اس لیے کررہا ہوں کہ مجھے جنرل مشرف نے فوج میں ترقی نہیں دی۔ دوسری مرتبہ یہ الزام مجھ پر لگایا گیا تھا اور دونوں مرتبہ چونکہ مشرف صاحب مجھے دباؤ میں لانا چاہتے تھے، انہوں نے اس الزام کو قبول کیا۔ ان کے کھیل میں فٹ ہوتا تھا۔ یہ تسلیم کرلینے سے کہ میں اصولی بات کررہا ہوں، ان کے کردار پر آنچ آتی تھی۔ خیر، میں حامد صاحب کے دفتر پہنچا تو کہنے لگے کہ صدر صاحب نے بلایا ہے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ کیا میرے بارے میں یہ کہا جارہا ہے کہ میں پیپلز پارٹی کے ساتھ مل کر اس انکوائری سے جنرل مشرف کی حکومت کو بدنام کرنے کی کوشش کررہا ہوں؟ فائلوں کے کاغذ ٹٹولتے ہوئے کہنے لگے ’’یہ اسلام آباد ہے، یہاں ہر قسم کی باتیں ہوتی ہیں۔ تم ان پر دھیان نہ دیا کرو‘‘۔ میں نے کہا ’’میں اسلام آباد کی بات نہیں کررہا‘‘۔ پھر ان کی طرف انگلی کا اشارہ کرکے کہا ’’میں آپ کی بات کررہا ہوں‘‘۔ کہنے لگے ’’تم خوامخواہ جذباتی ہورہے ہو۔ ایسا کچھ نہیں ہے‘‘۔ پھر ہم صدر صاحب کے دفتر کی طرف چلے گئے۔ یہاں صدر صاحب سے وہی بدتمیزی سی ملاقات ہوئی، جس کا ذکر پہلے کیا تھا۔ ان کی میز پر جو NAB کی انکوائری رپورٹ پڑی تھی، جسے انہوں نے بڑی نخوت سے پرے دھکیلا تھا، اس پر جنرل حامد صاحب کا نوٹ لکھا تھا کہ یہ وہی الزامات ہیں جو پیپلز پارٹی کی رخسانہ زبیری صاحبہ نے سپریم کورٹ میں لگائے ہیں۔ شوکت عزیز صاحب سے آخری ملاقات جب ہوئی تو کہنے لگے کہ آپ تیل کی انکوائری بند کردیں اس سے آپ کو کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ شاید یہ خبر مل چکی تھی کہ مشرف صاحب مجھ سے بہت ناراض ہیں، اس لیے یہ بھی طیش میں تھے۔ میرے چہرے کی طرف انگلی کا اشارہ کرکے کہنے لگے ’’میں آپ کو یقین سے کہہ رہا ہوں کہ اس میں کوئی کرپشن نہیں ہے‘‘۔ میں نے بھی اسی طرح ان کے چہرے کی طرف انگلی اٹھا کر کہا ’’میں بھی آپ کو یقین سے کہہ رہا ہوں کہ اس انکوائری کو انجام تک پہنچا کر رہوں گا‘‘ اور اٹھ کر ان کے دفتر سے باہر آگیا۔ اس کے بعد بس ایک مرتبہ اینٹی کرپشن ڈے پر آمنا سامنا ہوا تھا، جہاں وہ چیف گیسٹ تھے اور اپنی تقریر میں NAB کو خوب برا بھلا کہا۔ مگر شاید یہ ہتک اس کام کو کرنے کی قیمت تھی۔ کافی دنوں تک خاموشی رہی۔ پھر کچھ لوگ، جو مجھے اور جنرل مشرف دونوں کو جانتے تھے، صلح صفائی کی کوششیں کرتے رہے، کہ یہ معاملہ کسی طرح موزوں انجام کو پہنچ جائے۔ ان کی مداخلت سے، ایک شام میری اور صدر صاحب کی ملاقات پریذیڈنٹ ہاؤس کے رہائشی حصے میں ہوئی۔ بہت اچھے ماحول میں بات ہوئی۔ جنرل مشرف نے پوچھا ’’تم کیا چاہتے ہو؟‘‘۔ میں نے کہا کہ اگر NAB کی انکوائری پر اعتبار نہیں، تو کسی غیر جانبدار ماہرین کی ٹیم سے اس انکوائری پر نظر ثانی کرالیں، وزیراعظم کے مشیر تو غیر جانبدار نہیں۔ یہ بات ان کو پہلے بھی کہلوائی جاچکی تھی۔ اسی نوٹ پر یہ ملاقات ہوئی تھی۔ کہنے لگے ’’ہاں، اگر تم چاہتے ہو تو ایسے کرلیتے ہیں۔ ڈاکٹر عشرت صاحب، جو اسٹیٹ بینک کے گورنر تھے، کیسے رہیں گے؟‘‘۔ میں نے کوئی اعتراض نہ کیا، تو کہا۔ ’’وہ ان معاملات کو بہت اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ پیسے کے کھیل بہت الجھے ہوئے ہوتے ہیں، یہ میری اور تمہاری سمجھ سے باہر ہیں۔ میں عشرت صاحب کی نگرانی میں ایک ٹیم لگادیتا ہو، وہ دیکھ لیں گے‘‘۔ میں نے باتوں باتوں میں یہ بھی کہا کہ آپ کو جو بار بار یہ بتایا جاتا ہے کہ میں پروموٹ نہ ہونے پر آپ سے خفا ہوں، اس بات کو اپنے ذہن سے نکال دیں، ورنہ ہر بات پر آپ شک میں مبتلا ہوجائیں گے۔ میں نے ان سے کہا کہ میں پروموشن کا خواہشمند ہوتا تو آپ پر یہ بات ظاہر ہوتی۔ میں نے انہیں وہ بھی بتایا جو میں نے اپنی پروموشن کے سلسلے میں ان کے سابقہ اسٹاف افسر جنرل ندیم تاج سے کہا تھا۔ انہوں نے بہت حیرانی سے اس بات کو سنا۔ میں نے ان سے یہ بھی کہا کہ مجھے جو ہدایات دینی ہوں، وہ جنرل حامد کے ذریعے نہ دی جائیں، کیونکہ میں اب ان پر اعتبار نہیں کرسکتا۔ کہنے لگے کہ اب آپ سے جو بات بھی کرنی ہوگی طارق عزیز صاحب کے ذریعے سے ہی ہوگی۔ انہوں نے بعد میں کسی سے شکوہ بھی کیا کہ کیسا آدمی ہے، مجھ سے کہتا ہے کہ تمہارا چیف آف اسٹاف اعتبار کے لائق نہیں! خیر، ہماری ملاقات بہت اچھے نوٹ پر ختم ہوئی۔ انہوں نے مجھے کافی کے ساتھ سگار بھی پلایا، الوداع کرتے وقت گلے لگایا اور گال بھی چوما۔ آج مجھے یہ سب لکھتے ہوئے افسوس ہوتا ہے کہ کاش وہ شخص کچھ حوصلہ کرتا، سچ پر کھڑا رہتا تو ملک کی تقدیر بدل سکتا تھا۔ سب ہی اس کے ساتھ تھے۔

(جاری ہے)

☆☆☆☆☆

روزنامہ امت کراچی/حیدرآباد

قسط نمبر 30

’کرپشن مافیا کو نیب کے ہر کام کی خبر ہو جاتی تھی‘

آئل کمپنیوں سے متعلق انکوائریز سے ڈاکٹر عشرت حسین نے اختلاف کرتے ہوئے انہیں پالیسی کے خلاف قرار دیا۔ کرپشن کے آگے حکمران بھی بے بس ہیں۔ میں نے بہت کوشش کی مگر صرف نظام سے لڑتا رہا۔ لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کی کتاب سے اقتباس
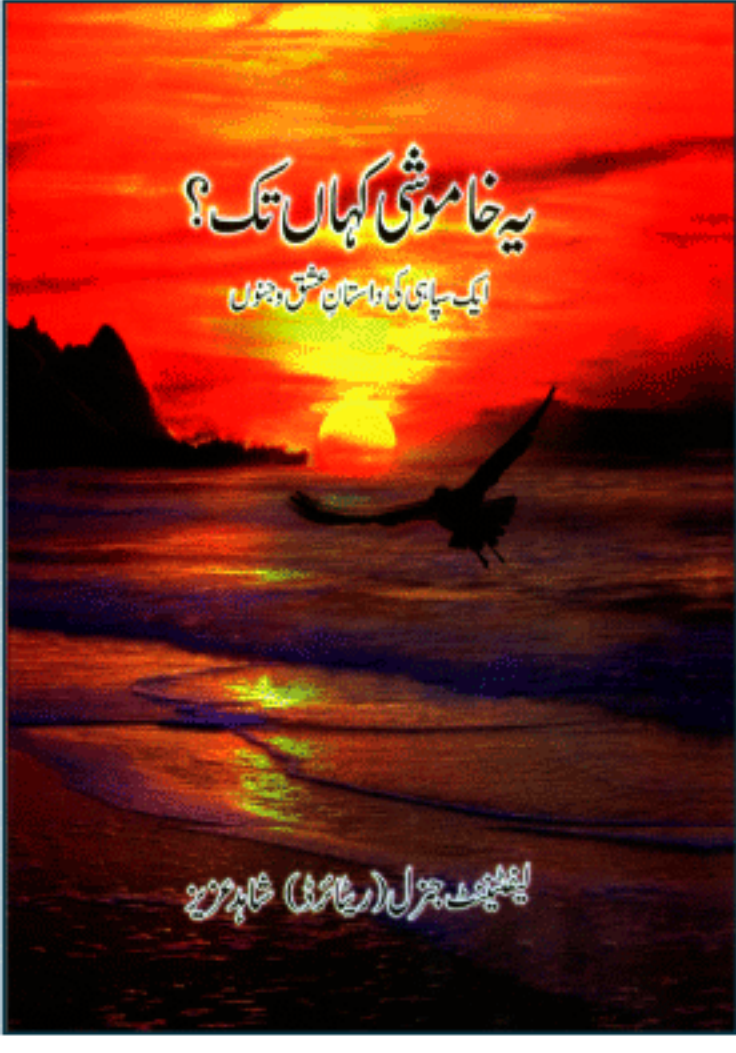
دوسرے دن مجھے جنرل ندیم تاج کا فون آیا۔ وہ ان دنوں PMA میں کمانڈنٹ تھے۔ انہوں نے بتایا کہ جنرل مشرف نے ان سے فون پر اس بات کی تصدیق چاہی، جو میں نے ان سے اپنی پروموشن کے سلسلے میں کہی تھی۔ کہنے لگے۔ ”میں نے ان کو بتا دیا کہ ایسی بات آپ نے کہی تھی۔“ میں نے کہا۔ ”یہ بات تو آپ کو ان دنوں ہی بتا دینی چاہئے تھی۔“ تو کہا کہ، یہ بتانا انہوں نے اس وقت مناسب نہیں سمجھا تھا۔ شاید صدر صاحب سے اس وقت یہ کہہ کر مجھے یوں ترقی کے دائرے سے باہر چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔

اسی دوران NAB کی ٹیموں نے ڈیزل کے دو ٹینکروں پر کراچی پورٹ میں دو مختلف دنوں میں چھاپہ مار کر ان سے سیمپل حاصل کئے اور جب فوج کی لیبارٹری سے ٹیسٹ کروائے تو پتا چلا کہ جو گریڈ کاغذات پر لکھا تھا اس سے بہت خراب گریڈ کا ڈیزل تھا۔ شاید دو چار دن ہی گزرے ہوں گے کہ فوج کی ٹیسٹنگ لیبارٹری سے خط موصول ہوا کہ ہماری پچھلی رپورٹ غلط تھی، ڈیزل ٹھیک تھا، نئی رپورٹ حاضر ہے۔ تیل کے کاروباریوں کے ہاتھ خاصے دور تک پھیلے ہوئے تھے، NAB کے ہر کام کی انہیں خبر ہو جاتی اور کرپشن مافیا حرکت میں آجاتا۔ کسی کارروائی کا جواز نہ رہا۔ پھر دو اور لیبارٹریوں سے چیک کروایا، مگر انہوں نے بھی ڈیزل ٹھیک ہونے کی رپورٹ دی۔ پھر یہ سیمپل جرمنی بھجوائے گئے۔ میرے NAB میں رہتے ہوئے سلسلہ یہیں تک پہنچا تھا۔ اور کئی اہم کیسوں پر تفصیلات جمع کرنے کا کام بھی شروع ہو چکا تھا۔ ان میں OGDCL (Oil and Gas Development Corporation Ltd.) کے کئی ایشو تھے، پرائیویٹائزیشن کمیشن کے چند اہم کیس اور منرل ڈیولپمنٹ سے متعلق کچھ تفصیلات شامل تھیں۔ کئی اہم شخصیات کے بارے میں لوگوں نے کافی شواہد جمع کر کے مجھ تک پہنچائے۔ ان میں کچھ فوج کے افسران اور ان کے رشتہ دار بھی شامل تھے، جن کے خلاف ریٹائرمنٹ سے پہلے انکوائری نہیں کھولی جاسکتی تھی۔ اہم شواہد کی کاپیاں میں اپنے پاس رکھ لیتا کہ کہیں NAB میں گم نہ جائیں۔ نیشنل بینک کے بھی کئی مسائل زیر تفتیش تھے اور اس سلسلے میں بھی وزیراعظم صاحب پریشان تھے کہ بینکوں کا کام اس طرح بند ہو جائے گا۔ اسٹاک ایکسچینج کے بارے میں خاص ہدایات دی گئی تھیں کہ ملک کی معیشت کو نہ جھنجھوڑیں، اسے ہاتھ نہ لگائیں۔

میں یہاں تیل کی انکوائری کی تفصیلات میں نہیں جانا چاہتا، مگر اتنا ضرور کہنا چاہوں گا کہ تیل کی پاکستانی کمپنیوں کے منافع جات ایسے تھے کہ OGRA کے آنے کے بعد، 05-2004ء میں اٹک آئل کمپنی کا منافع 4,332 فیصد بڑھ گیا تھا، نیشنل ریفائنری کا منافع 3,578 فیصد بڑھا، پاک ریفائنری کا منافع 717، فیصد بڑھا اور PARCO کے منافع میں 597 فیصد بہتری آئی۔ یہ اعداد و شمار وزارت کی اکتوبر 2005ء کی سمری میں دیئے ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ تیل بیچنے والی کمپنیوں کے منافع میں بھی خاصا اضافہ ہوا۔ انکوائری چونکہ مکمل نہیں کرنے دی گئی، اس لیے یہ بات واضح نہ ہو سکی کہ حکومت کے کون کون سے کارندوں نے کتنا ناجائز فائدہ حاصل کیا۔

انکوائری کو دوبارہ دیکھنے کے لیے کوئی ٹیم تو نہیں لگائی گئی، صرف ڈاکٹر عشرت صاحب کو ہی ذمہ دے دیا گیا۔ کچھ دنوں بعد وہ مجھ سے ملنے بھی آئے۔ انہوں نے قریب دو ماہ لگا کر اس انکوائری کو دوبارہ دیکھا۔ 6 دسمبر 2006ء کو ہماری انکوائری پر ڈاکٹر عشرت صاحب کی رپورٹ صدر صاحب کے دفتر سے موصول ہوئی۔ ڈاکٹر عشرت صاحب نے NAB کے چند انکشافات سے اختلاف کیا اور بقایا کو کام کرنے والوں کو غلطیاں ظاہر کیا۔ پھر وزیراعظم کے مشیروں کی طرح، یہ رنگ دیا کہ NAB پالیسی میں جھانک رہا ہے۔ حالانکہ یہ سرے سے غلط تھا۔ انہوں نے آخر میں لکھا کہ میں نہیں سمجھتا کہ تیل کمپنیوں کو جان بوجھ کر ناجائز منافع کمانے دیا گیا ہے۔ میں ان کی رپورٹ پڑھ کر حیران نہیں ہوا، مجھے یہی توقع تھی۔ سب ایک ہی سلسلے کی کڑیاں تھیں۔

ڈاکٹر عشرت صاحب کی رپورٹ کے ساتھ منسلک جنرل حامد صاحب کے خط میں لکھا تھا، ”آپ ہی کی منظوری سے ڈاکٹر عشرت حسین صاحب کو، جن کا بہت وسیع تجربہ ہے اور بین الاقوامی ساکھ رکھتے ہیں، آپ کی انکوائری اور وزیراعظم صاحب کے مشیروں کی رپورٹ کا تجزیہ کرنے کو کہا گیا تھا“، خط کے آخر میں لکھا تھا، ”اب جب کہ مختلف سطحوں پر اس کی تفصیلی جانچ پڑتال مکمل ہو چکی ہے، NAB اپنا نتیجہ اخذ کر کے اپنی رپورٹ بنالے“۔ میں طارق عزیز صاحب سے جا کر ملا۔ وہ ان دنوں نیشنل سیکورٹی کونسل میں تھے۔ کہنے لگے کہ آپ کو ڈاکٹر عشرت صاحب کی رپورٹ پڑھ کر تسلی ہو گئی ہو گی، اب یہ کیس بند کر دیں۔ سپریم کورٹ کو بھی اپنا جواب بجھوا دیں۔ انہوں نے مجھے بیس صفحات پر مشتمل ایک رپورٹ بھی دی، اور کہا کہ یہ وہ رپورٹ ہے جسے آپ اپنی آخری رپورٹ بنا کر NAB کی طرف سے جاری کر سکتے ہیں۔ یہی رپورٹ کورٹ کو بھی بجھوا دیں۔ رپورٹ کا لب لباب یہ تھا کہ NAB کو تسلی ہے کہ اس سلسلے میں کوئی کرپشن نہیں ہوئی۔

میں نے طارق صاحب سے کہا، ”ڈاکٹر عشرت کو اس لئے تمام چیزوں کو دیکھنے کے لئے کہا گیا تھا کیونکہ، صدر صاحب کے مطابق، مجھے ان چیزوں کی سمجھ نہیں ہے۔ تو اگر میں ان معاملات کی سمجھ ہی نہیں رکھتا، تو مجھے ڈاکٹر صاحب کی رپورٹ بھلا کیا سمجھ آئے گی؟ اور بغیر سمجھے ہوئے میں کیسے کہہ دوں کہ کرپشن نہیں ہوئی؟ اس مسئلے کا یہی حل ہے کہ میری انکوائری رپورٹ بھی سپریم کورٹ کو دے دی جائے اور ڈاکٹر عشرت کا تجزیہ بھی۔ پھر اگر کورٹ کی سمجھ میں بات آ گئی، تو وہ خود ہی اس کا فیصلہ کر لیں گے“۔ طارق صاحب نے مجھے کافی سمجھانے کی کوشش کی، مگر میں بات یہیں چھوڑ کر آ گیا۔

اخباروں میں تیل کی بیرونی کمپنیوں کی طرف سے اعلان کیا گیا کہ اگر NAB نے تیل کے بارے میں انکوائری بند نہ کی تو وہ پاکستان میں اپنا کاروبار بند کر دیں گی۔ انکوائری کسی کمپنی کے خلاف تو ہو نہیں رہی تھی، صرف حکومت کے افسران کی کارکردگی زیر تفتیش تھی۔ مگر ان ہی سے یہ کمپنیاں ناجائز منافع کماتی تھیں۔ اب ان کی امداد میں آ کھڑی ہوئیں، پھر ان کا اپنا بھی ایسا منافع بند ہونے کا خدشہ تھا۔ اس دھمکی پر خاصی پریشانی کا اظہار کیا گیا کہ عوام کے لئے دشواریاں پیدا کی جا رہی ہیں، ملک کی معیشت تباہ کی جا رہی ہے۔ کچھ دن مجھ پر یوں ہی دباؤ پڑتا رہا کہ اب بہت ہو چکا، اس معاملے کو ختم کرو۔ میں نے طارق عزیز صاحب سے کہا کہ پھر یہ سارا مسئلہ ایگزیکٹو بورڈ کے سامنے رکھ دیتا ہوں۔ انہوں نے پوچھا کہ ایگزیکٹو بورڈ کیا ہوتا ہے؟ جب میں نے تفصیلات بتائیں، تو کہنے لگے یہ بات کو پھیلانا ہوا، سب کو تمام تفصیلات معلوم ہو جائیں گی۔ پھر پوچھا کہ، آپ کو آخر ایگزیکٹو بورڈ بنا کر اپنے ہاتھ باندھنے کی کیا ضرورت تھی؟ میں نے کہا کہ NAB کے قوانین کے مطابق میرا ذمہ ہے کہ کرپشن کی روک تھام کے لئے جو بھی مناسب سمجھتا ہوں، وہ اقدام لوں۔ یہ اس ہی سلسلے میں بنایا ہے کہ اس ادارے کے اندر بھی ہیر پھیر کی گنجائش ختم ہو، شفاف طریقے پر کام ہو۔ یہ ادارہ اعتبار کے لائق بنے۔ بات ابھی یہیں پھر رہی تھی کہ چیف جسٹس صاحب کے ساتھ حکومت کے مسائل ابھرنے لگے، پھر بے نظیر صاحبہ کے مقدمات اہمیت لے گئے اور مجھے NAB چھوڑنا پڑا۔

وقت گزرنے کے کافی عرصے بعد میرے علم میں آیا کہ 23 دسمبر کو سپریم کورٹ نے احکام جاری کئے تھے کہ 12 دسمبر کو اس کیس کی ہیئرنگ (سماعت) ہوئی، جس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ ”حکومت کی طرف سے کسی جامع جواب کے بغیر اس کیس کا فیصلہ نہیں ہو سکتا۔“ اور اگلی ہیئرنگ کی تاریخ 16 جنوری کی دی گئی۔ یہ احکام حکومت کے علاوہ، چیئرمین OGRA، آئل کمپنیوں کی ایڈوائزری کمیٹی OCAC اور تیل کی کمپنیوں کے مالکان کو بھیجے گئے۔ NAB کو کوئی اطلاع نہیں دی گئی۔ یہ بھی سننے میں آیا کہ حکومت کی طرف سے ایک جامع جواب کورٹ میں جمع کروایا گیا تھا، جو یقیناً کسی کی سمجھ میں نہیں آیا ہوگا۔

NAB سے فراغت کے کافی عرصے بعد، جسٹس رانا بھگوان داس صاحب کی سربراہی میں ایک جوڈیشل کمیشن قائم کیا گیا، جس نے مجھے 3 جون 2009ء کو بلایا۔ تیل کی وزارت اور OGRA کے افسران کو بھی۔ میں نے انہیں بھی ساری تفصیلات بتائیں۔ پھر نہ جانے اس سلسلے کا کیا بنا۔ اس تمام کھیل پر کیا تبصرہ کروں۔ کرپشن نے ہمارے نظام میں ایسے پنجے گاڑے ہیں کہ، حکمراں بھی بے بس ہیں۔ اگر وہ کرپشن کو نظر انداز نہ کریں تو حکومت گر جائے گی، یا حکومت کا سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ اس نظام میں کرپشن کے خلاف جیتنا تو دور کی بات، جنگ ہی نہیں لڑی جا سکتی۔ میں نے بہت کوشش کی، مگر صرف نظام سے ہی لڑتا رہا۔ جب تک یہ نظام نہیں بدلے گا، کچھ نہیں بدلے گا۔ اس نظام کی موجودگی میں۔ ملک سے کرپشن نہیں مٹائی جا سکتی۔

☆☆☆☆☆

روزنامہ امت کراچی/حیدرآباد

قسط نمبر 31

مُشرف نے نیبُ کی نگرانی کے لئے دوافسر مُقرر کر دیئے

حاضر سروس افسران محمد صدیق اور حسن وسیم افضل کو ڈپٹی چیئرمین بنا کر بھیجا گیا-بینظیر بھٹو کیخلاف کیسز بند کرنے کیلئے دباؤ بڑھ گیا- فائلیں مجھ سے لیکر وسیم افضل کو دیدی گئیں-لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کی کتاب سے اقتباس
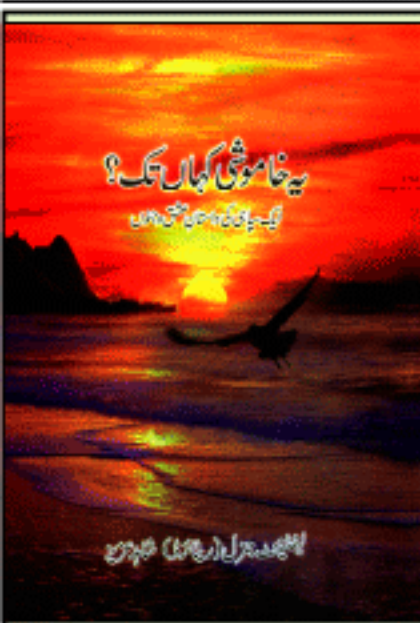
لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کا شمار افواج پاکستان کے مایہ ناز، بلند ہمت، باکردار اور اصول پسند افسران میں ہوتا ہے۔انہیں جس قدر کامیابیاں حاصل ہوئیں، اس کی وجہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر مکمل یقین ہے۔جہاں کہیں بھی وطن عزیز کے دفاع اور قومی مفادات کا معاملہ سامنے آیا، وہ حکمرانوں کے سامنے بڑی جرأت اور استقامت سے حاضر سروس جنرل ہوتے ہوئے بھی اختلافی رائے پیش کرتے رہے۔ڈائریکٹر جنرل تجزیاتی ونگ کی حیثیت سے کارگل کے محاذ کے حوالے سے انہوں نے ہمیشہ حقیقت پسندانہ تجزیہ اعلیٰ فوجی حکام کو مہیا کیا۔نائن الیون (11/9) کے بعد امریکہ کیلئے فوجی سہولتوں کی فراہمی کے معاملے پر بھی اعلیٰ سطحی فوجی اجلاس میں کھل کر کلمہ حق بلند کیا۔ان کی ملازمت کا عرصہ فیض کے اس مصرعے کی عملی تفسیر رہا:

جو رکے تو کوہِ گراں تھے ہم، جو چلے تو جاں سے گزر گئے

لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کی اجازت سے، ان کی کتاب ''یہ خاموشی کہاں تک'' سے منتخب اقتباسات قارئین کی معلومات اور دلچسپی کے لیے پیش کیے جارہے ہیں۔

''بینظیر بھٹو کیخلاف تمام کیس بند کردیئے گئے ہیں۔شاہد سے کہیں کہ اس کام کو مکمل کرنے کے طریقے اختیار کرے''۔طارق عزیز صاحب نے مجھے جنرل مشرف کا حکم نامہ سنایا اور پوچھا کہ اب اسے کیسے کیا جائے؟ بہت دنوں سے یہ مسئلہ چل رہا تھا۔میں ٹال مٹول کرتا رہا کہ شاید کوئی بہتری کی صورت نکل آئے۔شاید بے نظیر صاحبہ سے یہ سیاسی مذاکرات ناکام ہوجائیں۔مگر اب سامنے دیوار کھڑی تھی۔صدارتی حکم جاری ہوچکا تھا۔میں نے کہا ''میرے پاس تو اور کوئی طریقہ نہیں، سوائے اس کے کہ میں یہ عہدہ چھوڑ دوں، پھر آپ جیسے چاہیں ان کیسوں کو بند کریں''۔مجھے کچھ سمجھانے لگے، مگر میں نے کہا یہ مجھ سے نہیں ہوسکتا اور اٹھ کر وہاں سے چلا آیا۔

میرے نیب میں آنے پر یہاں دو ڈپٹی چیئرمین لگا دیئے گئے تھے۔میجر جنرل محمد صدیق اور حسن وسیم افضل صاحب۔حاضر سروس جنرل کو شاید اس لیے لگایا کہ میرے کام پر نظر رہے اور NAB ہاتھ سے نہ نکل جائے۔مجھ کو بتایا گیا کہ افضل صاحب کو خصوصی طور پر بے نظیر بھٹو صاحبہ اور ان کے خاندان کے افراد کے کیسوں کو دیکھنے کے لیے لگایا گیا ہے، تاکہ انہیں تیزی سے انجام تک پہنچایا جائے۔نواز شریف صاحب کی حکومت میں بھی افضل صاحب ہی بے نظیر صاحبہ کے کیسوں کے ذمہ دار تھے۔ان کیسوں سے متعلقہ تمام فائلیں بھی افضل صاحب کو دے دی گئی تھیں اور مجھ سے جنرل حامد صاحب نے کہا کہ اس سلسلے میں، آپ اپنی تمام قانونی اتھارٹی بھی ان کے نام کردیں، کہ یہی ان تمام کیسوں کے ذمہ دار ہوں گے۔یہ بھی میں نے انہیں لکھ کر دے دیا تھا۔

پہلے تو افضل صاحب نے شکایت کی کہ میرا دفتر ٹھیک نہیں ہے، پھر جنرل حامد سے کہلوایا کہ انہیں ایک علیحدہ مقام پر دفتر رکھنے کی اجازت دی جائے۔اسلام آباد میں ایک گھر کرائے پر لے لیا۔میں پھر بھی ان کیسوں کے بارے میں پوچھتا رہتا۔پھر مجھے جنرل حامد نے کہا کہ ان کے کام میں مداخلت نہ کروں، میں نے کہا کہ میں چیئرمین ہوں، مداخلت کیسی ہے، مجھے پتا تو ہو کہ کیا ہو رہا ہے۔پھر انہوں نے جنرل حامد سے اجازت لی اور اپنا دفتر لاہور منتقل کرلیا۔کچھ عرصے بعد مجھ سے کہا گیا کہ جو لوگ ان کے تحت کام کررہے ہیں ان کی تنخواہیں بڑھادی جائیں۔میں نے کہا کہ نیب میں دو قسم کی تنخواہیں تو نہیں دی جاسکتیں اور نہ ہی میرے پاس اتنا بجٹ ہے۔پھر انہیں غیر رسمی بجٹ بھی ملنے لگا۔2007ء کے شروع میں طارق عزیز صاحب نے بتایا کہ برطانیہ اور امریکہ اس بات پر خاصا زور دے رہے ہیں کہ بے نظیر صاحبہ سے سمجھوتا کیا جائے اور انہیں واپس آنے کی اجازت دی جائے۔کہنے لگے کہ ان کے کیسوں کو شاید بند کرنا پڑے۔ابھی کچھ مذاکرات چل رہے ہیں۔میں نے اس سوچ سے اختلاف کیا، کہ یہ اس قوم سے بہت بڑی ناانصافی ہوگی کہ حکمرانوں کی لوٹ مار کے کیس بند کیے جائیں۔کہنے لگے بہت زیادہ دباؤ ہے، دیکھتے ہیں مذاکرات کیسے چلتے ہیں۔مارچ کے شروع میں ان کے دفتر میں ایک ملاقات ہوئی، جس میں وسیم افضل صاحب اور اٹارنی جنرل مخدوم علی خان صاحب بھی موجود تھے۔طارق عزیز صاحب نے بتایا کہ بے نظیر صاحبہ کو اسپین میں چلنے والے کیس پر زیادہ تشویش ہے۔وہ چاہتی ہیں کہ اگر مذاکرات آگے بڑھانے ہیں تو اسے بند کیا جائے۔میں ان کے کیسوں کے سلسلے میں 2006ء میں برطانیہ اور اسپین گیا تھا۔اسپین کا کیس NAB نے نہیں کیا تھا۔یہ اقوام متحدہ انکوائری کمیشن 2004ء کے فیصلے کے تحت دائر کیا گیا اور حکومت پاکستان اس میں 'Damaged Party' کے طور پر بعد میں شامل ہوئی۔اس کے سارے شواہد بھی اقوام متحدہ نے ہی فراہم کئے تھے، جن کی انکوائری کے تحت بے نظیر صاحبہ پر الزام تھا کہ ان کی کمپنی نے، اقوام متحدہ کے Oil Food Program کی خلاف ورزی کرتے ہوئے، صدام حسین صاحب کو دو ملین ڈالر دے کر تیل کے ٹھیکے حاصل کئے۔وسیم افضل صاحب اور میں، دونوں ہی اس کیس سے علیحدہ ہونے پر تیار نہیں تھے۔طارق عزیز صاحب نے کہا کہ فی الحال ہم کیس ختم کرنا نہیں چاہ رہے، صرف کچھ ایسا کرنا چاہتے ہیں کہ بے نظیر صاحبہ ہم پر بھروسہ کرسکیں، تاکہ مذاکرات میں جان پڑے۔کہنے لگے کہ اگر ہم اپنے اسپین کے اٹارنی کو تبدیل کریں، تو اس سے جو وقت ملے گا، اس عرصے میں ہم بات کو آگے بڑھا کر دیکھ سکتے ہیں۔وسیم افضل صاحب کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔لیکن کہنے لگے کہ مجھے لکھ کردے دیں۔طارق عزیز صاحب نے میری طرف دیکھا، میں نے کہا کہ وسیم صاحب کو تو میں پہلے ہی ان تمام چیزوں پر قانونی طور پر مجاز بنا چکا ہوں، انہیں میری لکھی ہوئی ہدایات کی ضرورت نہیں۔مگر وسیم صاحب شاید آئندہ ہونے والی کسی قانونی کارروائی کے خوف سے، لکھے ہوئے احکامات پر زور دے رہے تھے۔طارق عزیز صاحب بھی کچھ لکھ کر دینے پر رضامند نہیں تھے۔اٹارنی جنرل صاحب کا بھی خیال تھا کہ لکھ کر دینے میں شاید کسی قانونی کارروائی کا جواز بن سکتا ہو۔پھر میں نے کہا لائیں میں لکھ کر دے دیتا ہوں، سو چاہ یہ کرنا بھی چاہتے ہیں، ڈرتے بھی ہیں۔جب کرنا ہے، تو ڈرنا کیا۔ایک کاغذ پر کچھ لکھا، پڑھ کر سنایا تو اٹارنی جنرل صاحب نے کہا یہ نہ لکھیں۔پھر انہوں نے مجھے لکھوایا، اور میں نے وسیم افضل صاحب کو لکھ کر دیا کہ جو پاور آف اٹارنی کورٹ میں ہماری نمائندگی کرنے کے لیے دی گئی ہے اسے واپس لے لیا جائے، اور لائرز کا ایک نیا پینل بنائیں، جن میں سے کسی کو چنا جاسکے، جو اس کیس میں حکومت پاکستان کی نمائندگی کرے۔میں نے 7 مارچ کو یہ خط دستخط کرکے انہیں دے دیا۔بات ختم ہوگئی۔دل میں یہی دعا کرتا رہا کہ مذاکرات ناکام ہو جائیں۔نیب کی کارروائیوں سے حکومت اب تک اکتا چکی تھی۔اب الیکشن کی بھی تیاریاں شروع کرنے کا وقت آرہا تھا، جس میں NAB کے استعمال کا ارادہ نظر آتا تھا۔ان دنوں مجھ سے حکومت نے ان سیاست دانوں کے نام مانگے جن کے خلاف تفتیش چل رہی تھی۔میں نے نام دینے سے معذرت کرلی۔میں جانتا تھا کہ یہ نام سیاسی سودے بازی کے لیے مانگے گئے ہیں۔مجھ پر کافی دباؤ رہا۔جب کہیں سے بات نہ بنی، تو ایک پارلیمنٹری کمیٹی سے مجھے سرکاری خط بھجوایا گیا کہ یہ نام پارلیمنٹ کو چاہئیں۔میں نے لکھ کر جواب دیا کہ NAB نام دینے سے قاصر ہے۔پھر مجھے اعلیٰ سطح پر سمجھایا گیا کہ تم فوجی ہو، پارلیمنٹ کی اتھارٹی کو شاید سمجھتے نہیں۔تم اس کو انکار نہیں کرسکتے۔کیوں اپنے لیے مشکل کھڑی کرتے ہو؟ میں نے کہا کہ ہمارا آئین ہر شہری کی عزت کو تحفظ فراہم کرتا ہے۔پارلیمنٹ کو سمجھنا چاہئے کہ میرے نام دینے سے آئین کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔اگر میں حد سے تجاوز کررہا ہوں تو مجھے کورٹ میں لے جائیں، اگر سپریم کورٹ کہے گا تو نام دے دوں گا۔پھر بات ختم ہوگئی۔(جاری ہے)

☆☆☆☆☆

منگل/05مارچ2013ء

روزنامہ امت کراچی/حیدرآباد

آخری قسط

”اصولی اختلافات پر نیب سے استعفیٰ دے دیا“

مشرف کو مجبور کرسکتا تھا کہ وہ قانون میں ترمیم کرکے مجھے زبردستی نکال دیں-لیکن ایسا نہیں کیا-جس پر اعتبار کیا وہ بھی اسی نظام کا حصہ بن گیا-کسی پر اعتماد نہیں رہا تھا-لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کی کتاب سے اقتباس

حکومت نے نیب کو کنٹرول کرنے کیلئے ایک زور آزمائی اور کی۔ مجھے کہا گیا کہ صدر صاحب نے یہ فیصلہ دیا ہے کہ ایک کونسل بنے گی، جو نیب کے اہم کیسوں کو سنے گی۔ اس میں جنرل حامد، طارق عزیز، اٹارنی جنرل، میں اور نیب کے پراسیکیوٹر جنرل عرفان قادر بیٹھیں گے۔ قادر صاحب نہایت شائستہ طبیعت کے انسان تھے۔ اور ایک ان کے ڈپٹی تھے، ملک افضل، جنہوں نے سارے کام کا بوجھ اٹھایا ہوا تھا، اور بلاجھجک کام کرتے تھے۔ مجھے کہا گیا کہ جس کیس کی حکومت نشاندہی کرے گی، وہ اس کونسل کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ اگر یہ کونسل سمجھے گی کہ کیس کو آگے بڑھانا ہے، تو ہی نیب اس پر کارروائی کا مجاز ہوگا، ورنہ کیس بند کردیا جائے گا۔ میں نے کہا، کونسل کے سامنے کیس پیش کرنے پر مجھے کوئی اعتراض نہیں، میں ان کے مشوروں سے مستفید ہوں گا، لیکن کیس صرف اس وقت بند کروں گا جب میں سمجھوں گا کہ یہ کیس جائز نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ نیب کے قانون میں یہی لکھا ہے اور میں صرف اس قانون کے مطابق کام کرنے کا مجاز ہوں۔ اس کا تحفظ میری اخلاقی اور آئینی ذمہ داری ہے۔
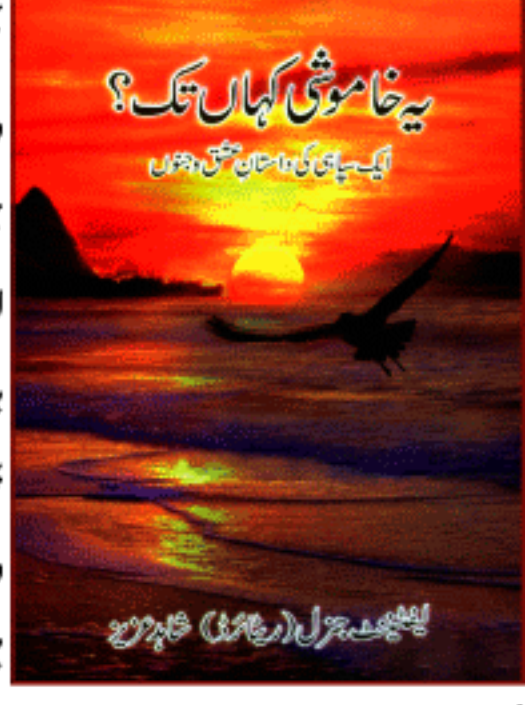
اس موضوع پر کافی دن تک لے دے ہوتی رہی، پھر مجھ سے کہا گیا کہ میں صدر صاحب کو NAB کی طرف سے ایک خط لکھوں کہ ایک جوڈیشل کمیشن تشکیل دیا جائے جو NAB کی کارروائیوں کو دیکھ سکے۔ میں نے 30 مارچ 2007ء کو اس موضوع پر خط لکھ کر بھیج دیا۔ مگر مشورہ یہ دیا کہ چونکہ 2002ء کی اینٹی کرپشن اسٹریٹجی نے پانچ برسوں میں کچھ حاصل نہیں کیا، تو ایک جوڈیشل کمیشن بنایا جائے جو اینٹی کرپشن کے ہر پہلو کا جائزہ لے اور ایک نئی اسٹریٹجی بنائے اور ایسے ڈھانچے اور قوانین تشکیل دے جو اس اسٹریٹجی کے مقاصد کو وقت مقررہ پر پورا کرسکیں۔ اس پر بھی خاصی ناراضگی رہی۔

پھر کچھ عرصے بعد خبر ملی کہ NAB کے قوانین کا جائزہ لیا جارہا ہے کہ ان میں کیا ترامیم کی جائیں کہ چیئرمین کو پوری طرح تابع کیا جاسکے۔

اپریل کے مہینے میں ایک دورے پر میں جنوبی افریقہ گیا، جہاں اینٹی کرپشن پر ایک بین الاقوامی کانفرنس ہورہی تھی۔ جب واپس آیا تو پتا چلا کہ میری غیر موجودگی میں ڈپٹی چیئرمین وسیم افضل کا دفتر، جو لاہور میں تھا، ختم کردیا گیا ہے اور بے نظیر صاحبہ اور ان کی فیملی کے کیسوں کے تمام کاغذات NAB اسلام آباد کے دفتر بھجوائے جاچکے ہیں۔ اب ساری ذمہ داری کا طوق میرے گلے میں ڈال دیا گیا تھا۔ طارق عزیز صاحب کو ملا تو کہنے لگے کہ بی بی صاحبہ کا اسپین والا کیس بند کردیں۔ میں نے جان چھڑانے کیلئے کہا کہ اگر آج میں کیس بند کردوں، اور کل بے نظیر صاحبہ مجھ پر ایک کیس کھول دیں، کہ میں نے چیئرمین NAB کی حیثیت سے ان پر جعلی کیس بنایا تھا اور ہتک عزت کا دعویٰ کردیں، تو میں کہاں جاؤں گا؟ کہنے لگے نہیں نہیں، ان معاملات میں ایسے نہیں ہوتا۔ مگر میں اسی کی اوٹ لیتا رہا۔ پھر انہوں نے کہا کہ جو رقم بھی بھرنی پڑی حکومت بھرے گی، آپ کیوں پریشان ہوتے ہیں؟ میں نے کہا میں اتنا بڑا رسک نہیں لے سکتا۔ کل حکومت بدل جائے تو پھر؟ کچھ دن اور یوں ہی گزر گئے۔ حکومت اور چیف جسٹس صاحب کے بیچ مسائل شروع ہوچکے تھے۔ لال مسجد کا مسئلہ بھی چل رہا تھا، بے نظیر صاحبہ کے کیسز کا معاملہ لٹکا رہا۔

پھر ایک دن طارق صاحب نے دفتر بلوایا۔ کہنے لگے ”ملک کا سیاسی استحکام داؤ پر لگا ہوا ہے، کوئی چھوٹی سی بات نہیں ہے۔ دنیا سے ہمارے تعلقات کا انحصار بھی اب اسی پر ہے کہ بے نظیر صاحبہ کے تمام مقدمات بند کردیئے جائیں“۔ کہا، آپ تو جانتے ہیں کہ برطانیہ اور امریکہ کا اس سلسلے میں کتنا دباؤ ہے۔ میں نے کہا کہ میں ان تمام باتوں کو سمجھتا ہوں، مگر اس کام کو کرنے میں میرے لیے بہت پیچیدگیاں ہیں۔ کہنے لگے آپ لندن چلے جائیں، وہاں رحمن ملک صاحب سے مل لیں، وہی بے نظیر صاحبہ کے کاروبار کو سنبھالتے ہیں، اور آپ کو وہی یقین دلا سکتے ہیں کہ آپ کا نقصان نہیں ہوگا۔ میں نے پوچھا کہ وہ کیا یقین دلائیں گے؟ تو ہنس کر کہنے لگے، آپ ان سے ملیں تو سہی۔ کہنے لگے پھر اسپین بھی چلے جائیں، وہاں بے نظیر صاحبہ کے وکیل آپ کو دستاویزی یقین دہانی بھی کرادیں گے، کہ آپ کے خلاف کوئی قانونی کارروائی نہیں کی جائے گی۔

ایک عرصے سے اس مسئلے کو ٹال رہا تھا مگر اب مزید ٹال مٹول کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ صاف کہنا پڑا کہ یہ مقدمات میں اصولی طور پر بند نہیں کرسکتا۔ میں نے کہا یہ میری موجودگی میں نہیں ہوگا۔ وہ کچھ ناراض ہوگئے کہ مجھے پہلے ہی بتادیتے، اتنے دنوں اس معاملے کو کیوں لٹکائے رکھا؟ میں واپس اپنے دفتر آگیا۔ اگلے دن پھر ان سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے مجھے وہ حکم نامہ سنایا جس کا ذکر شروع میں کیا ہے۔ صدر صاحب نے بے نظیر بھٹو کے مقدمات بند کردیئے تو میں اب اس سلسلے میں کیا کرسکتا تھا، سوائے اس کے میں یہ عہدہ چھوڑ دیتا۔ طارق عزیز صاحب کو یہ کہہ کر کہ اس کے علاوہ اور کوئی حل نہیں، میں اپنے دفتر واپس آگیا۔ دن گزرنے کو تھا کہ ان کا فون آیا۔ کہنے لگے، ہم نے اس موضوع پر ایک میٹنگ کی تھی۔ یہ بھی بتایا کہ اس میٹنگ میں کون کون تھے۔ پھر کہا کہ ہم سب کا یہی خیال ہے کہ آپ یہاں سے نہ جائیں اور اس مسئلے کو کسی طرح حل کرلیں۔ میں نے کہا کہ یہ ممکن نہیں۔ تو کہا کہ پھر اپنا استعفیٰ بھجوادیں۔ کچھ دیر بعد دوبارہ فون آیا کہ آج کل چیف جسٹس صاحب کا مسئلہ بھی چل رہا ہے اور لال مسجد کا بھی، اگر آپ ان حالات میں استعفیٰ دیں گے تو حکومت کو خاصا دھچکا لگے گا۔ کہنے لگے آپ سے گزارش ہے کہ خرابی صحت کی بنیاد پر دو ماہ کی چھٹی لے لیں، پھر اگر چاہیں تو استعفیٰ دے دیں۔ میں نے کہا کہ حکومت کو غیر مستحکم کرنا میرا مقصد نہیں، میں ایسے ہی کرلیتا ہوں۔ کہنے لگے آپ اور بیگم صاحبہ دو ماہ کے لیے بیرون ملک جہاں بھی جانا چاہتے ہوں چلے جائیں اور طبی معائنہ وغیرہ بھی جہاں سے چاہے کرالیں، تمام اخراجات ہم اٹھائیں گے۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا کہ اس کی ضرورت نہیں ہوگی۔

3 مئی 2007ء کا دن تھا۔ اسی دن دو ماہ کی میڈیکل بنیاد پر چھٹی کی درخواست وزیراعظم صاحب کو بھجوائی اور ڈپٹی چیئرمین میجر جنرل محمد صدیق کو چیئرمین کے طور پر کام کرنے کا مجاز نامہ دے کر گھر چلا گیا۔ پھر اس دن کے بعد دفتر نہیں گیا۔ چھٹیوں کے دوران مجھ پر لگاتار زور پڑتا رہا کہ اب آپ کی غیر حاضری میں مقدمات بند ہوچکے ہیں، آپ پر تو ان کا بوجھ نہیں ہے، تو آپ واپس آسکتے ہیں۔ مجھے استعفیٰ دینے کی مجبوری نہیں تھی۔ اپنی جگہ پر ڈٹ بھی سکتا تھا، مشرف صاحب کو مجبور کرتا کہ وہ قانون میں ترمیم کرکے مجھے زبردستی نکال دیں، مگر ایسا کیا نہیں۔ اس کا شاید صرف ایک ہی فائدہ ہوتا کہ میں ہیرو بن جاتا۔ چیف جسٹس صاحب کے جلوس میں شامل ہوجاتا۔ گرتی ہوئی حکومت کو گرانے میں میرا بھی ہاتھ ہوتا۔ سیاسی روپ دھار لیتا۔ اوروں کی طرح چیزوں کو بدل دینے کا نعرہ میں بھی لگاتا۔ لیکن میرا دل اس طرف مائل نہیں تھا۔ اس کا فائدہ کوئی سیاست دان ہی اٹھاتا، جن میں سے کسی پر بھی میرا اعتقاد نہ تھا۔ کس کے ساتھ کھڑا ہوتا؟ جس کا اعتبار کیا تھا، جس کے ساتھ کھڑا ہوا تھا، وہ بھی ان ہی سیاست دانوں کے ساتھ مل گیا تھا، اسی نظام کا حصہ بن گیا تھا۔

☆☆☆☆☆